آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مئی 2018

www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

اردو دنیا

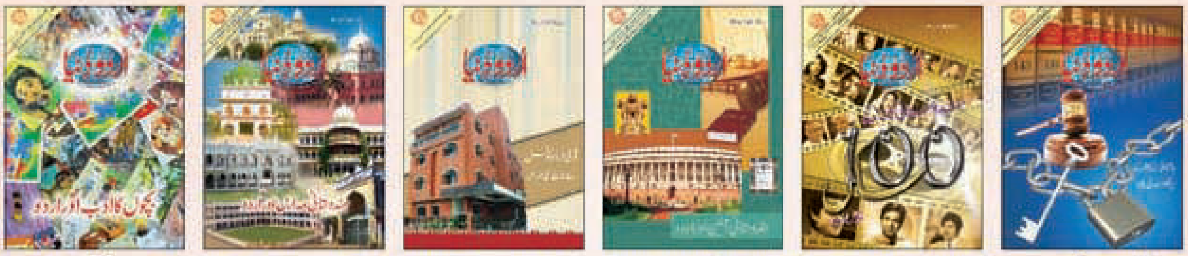

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھئے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے | جلد: 2 شمارہ: 5 مئی 2018 | صفحات: Total Pages 64

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

ادار یہ

مکالمہ — مدیر — 4

روبرو

لڑکیوں میں بھی.......... — محمد قمر تبریز — 5

پرواز کے نئے آسمان

اپنی مٹی میں رہ کر.......... — افروز عالم ساحل — 8

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 10

جہان نسواں

خالہ شبو — نور جہاں — 11

من کہ...... — خورشید جہاں — 13

جدید خواتین افسانہ نگار...... — سید واصفہ غنی — 17

فن خاکہ نگاری — آسیہ طلعت — 20

غالب کی خوش طبعی — چمن آرا — 22

حمیدہ سلطان کے ناول 'رنگ محل' — نشاں زیدی — 26

قانون میں خواتین

خواتین کے خلاف خانگی تشدد.......... — خواجہ عبدالمنتقم — 29

کہانیاں

کفارہ — ممتاز شیریں — 32

ان بن — ندیم غوری — 38

پت جھڑ کی پتیاں — پروین طلحہ/صبیحہ انور — 43

ٹوٹ گیا اک تارا — تسنیم سلیم چھتاری — 46

حسن سخن

ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید 51، مسعودہ نکہت 52، نجمہ عزیز مراد آبادی 52

شہناز نبی 53 شہناز فاطمہ صدیقی 54 آرتی کماری 54

باورچی خانہ

لذیذ پکوان — 55

صحت

عورتوں کی مخصوص غذائیں — احسان رؤف — 57

آرائش و زیبائش

حسن کی نگہداشت — 59

تاثرات: نگر نگر سے — 61

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقامِ اشاعت و صدر دفتر: فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066 فون: 26109746، فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مکالمہ

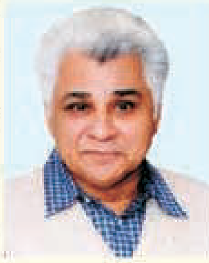

یکم مئی کو عالمی طور پر یومِ مزدور قرار دیا گیا ہے اور ہر برس ساری دنیا میں یکم مئی کو نہایت باوقار طریقہ سے منایا جاتا ہے۔ اسے اتفاق کہیں یا حسن اتفاق کہ اس ماہ کے دوسرے اتوار کو عالمی طور پر یومِ مادر بھی منایا جاتا ہے۔ یومِ مادر اور یومِ مزدور دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ جہاں یوم مزدور منانے والے اس موقع پر لینن کا یہ نعرہ یاد کرتے ہیں کہ 'دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ' وہیں یومِ مادر کا آغاز کرنے والی جولیا وارڈ ہاروے نے دوسری جنگ عظیم کے بعد غالباً 1870 میں ایک مضمون لکھ کر یہ گذارش کی کہ عالمی امن کی ضرورت کے پیش نظر دنیا بھر کی ماؤں کو متحد ہو جانا چاہیے۔ 1872 میں مدرس ڈے کو سرکاری طور پر منائے جانے کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کے لیے 2 جون کی تاریخ مقرر کی جائے اور اس دن کو امن کے نام منسوب کرتے ہوئے سالانہ تعطیل کی فہرست میں شامل کیا جانا چاہیے۔ جولیا کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔ ان کے اس خیال کے پھلنے پھولنے میں وقت لگا اور پھر امریکہ کی ایک خاتون اینا جاروِس (Anna Jarvis) نے 1908 میں گرافٹن کے میتھوڈیسٹ چرچ میں ایک پروقار پہلا آفیشیل مدرڈے منایا اور پھر یہ بات اس قدر مشتہر ہوئی کہ 1914 میں امریکی صدر وُڈرو ولسن (Woodrow Wilson) نے مئی کے دوسرے اتوار کو سرکاری طور پر مدرس ڈے منائے جانے کا اعلان کر دیا۔ آج ساری دنیا عالمی پیمانے پر نہایت تزک و احتشام سے یومِ مادر مناتی ہے اور اس موقع پر ساری دنیا میں خوب مضامین لکھے جاتے ہیں اور متعدد پروگرام بھی منعقد ہوتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ساری دنیا میں جہاں ایک طرف یومِ مادر بڑے پیمانے پر منانے کا رجحان بڑھا ہے وہیں عالمی پیمانے پر اولڈ ہاؤس کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہمیں یہ بات بے حد عجیب لگتی ہے کہ جس تیزی سے ہمارے آس پاس ترقی کے اجالے ایستادہ ہوئے ہیں اس کی روشنی کی چکا چوند سے ہمارے اقدار لرزنے لگے ہیں۔ اب یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ گھر سے مراد باپ ماں اور اس کے بچے ہیں۔ جدید نظریہ سازوں نے یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ آخر باپ اور ماں کے بھی باپ اور ماں ہوتے ہیں اور پھر جن باپ اور بچوں کو ایک خاندان قرار دے کر اس خاندان کے مکمل ہونے کی سند دے دی جاتی ہے۔ اس خاندان میں جب دوسرا خاندان قائم ہونے لگتا ہے تو پھر وہاں عتاب کا شکار ماں باپ ہی کیوں ہوتے ہیں کیوں خاندان کے اس بانی کو اولڈ ہوم کا راستہ دکھا دیا جاتا ہے؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات ہیں جس کا جواب ہمیں تلاش کرنا ہوگا ورنہ پھر اس طرح سے فیشن کے طور پر یومِ مادر، یوم خواتین منانے کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ بوڑھے اور بڑے درخت ہمیشہ زیادہ سایہ دار ہوتے ہیں اور ہم پڑھتے رہے ہیں کہ ہماری وہ تہذیب جو اب قصۂ پارینہ بنتی جا رہی ہے اور جس کا کوئی منظر جب ہم پرانی فلموں، کلاسیکل ادب میں دیکھتے ہیں تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ان بڑے اور بوڑھے درختوں کے سائے میں ہی پروان چڑھے تھے۔ ہمارے ان بزرگوں کے تجربات، ان کی تہذیب، ان کی زبان اور ان کی وہ پرورش جس کی بنیاد میں انسانیت اور امن و محبت کے پتھر ایستادہ ہوتے تھے۔ اب رفتہ رفتہ ختم ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا میں بدامنی کی وبا پھوٹ پڑی ہے۔ انسانوں کی بستی میں امن و امان ڈھونڈنا پڑ رہا ہے اور یہ سب ترقی کے نام پر ہو رہا ہے۔ ایک طرف انسانیت تنزلی کے گہرے غار میں گرتی چلی جا رہی ہے دوسری طرف ہم ترقی کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ ہم یومِ مزدور کا جشن بھی مناتے ہیں اور مزدوروں کو خودکشی کرتے ہوئے بھی دیکھ رہے ہیں۔ ہم یومِ خواتین مناتے ہیں اور خواتین کے ساتھ جانوروں سے زیادہ ظالمانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، ہم یوم مادر مناتے ہیں اور ماں کو اولڈ ہوم میں رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس دوہرے چہرے کے ساتھ ہمیں تاریخ یاد رکھے گی لیکن مستقبل ایسے معاشرے کو تاریخ کے سیاہ نقطے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ وقت نے کروٹ لے لی ہے اور اب خواتین نہایت باوقار ہو کر میدانِ عمل میں آ رہی ہیں۔ حالیہ کامن ویلتھ گیم میں منیکا بترا نے ریکارڈ کامیابی حاصل کرتے ہوئے ان تمام مقابلوں میں میڈل حاصل کیے جس میں وہ شریک ہوئیں۔ اس بار پہلی ہندوستانی خاتون ہونے کا اعزاز بھی منیکا بترا کو ہی ملا جنھوں نے انڈیجول ٹیبل ٹینس میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اس بار کے کامن ویلتھ گیم کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ زیادہ تر خواتین کھلاڑیوں نے میڈل حاصل کیے۔ خواتین دنیا کے تمام اراکین اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے سب کو مبارک باد۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

محمد قمر تبریز

لڑکیوں میں بھی آسمان چھونے کی صلاحیت ہے

اسلام میں تعلیم پر جتنا زور دیا گیا ہے، اتنا شاید دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں۔ پھر بھی، نہ جانے کیوں مسلمان موجودہ دور میں تعلیم سے کوسوں دور ہیں۔ حالانکہ، یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم کے بغیر کامیابی کا تصور ناممکن سی بات ہے۔ مسلمانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا تو رواج بالکل بھی نہیں ہے۔ وہی پرانی سوچ کہ لڑکیوں کا کام تو صرف گھر کی دیکھ بھال کرنا اور مردوں کے مظالم سہنا ہے۔ لیکن، اس سوچ کو آج الہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی سیرت فاطمہ نے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ سیرت فاطمہ اپنے گاؤں کی واحد مسلم لڑکی ہیں، جنھوں نے پہلے گریجویشن کرکے دیگر لڑکیوں کے لیے تعلیم کے دروازے کھولے۔ اس کے بعد اس سال یوپی ایس سی امتحان میں 800 واں رینک حاصل کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلم معاشرہ میں اگر لڑکیوں کو بھی موقع دیا گیا، تو وہ بہتر سے بہتر مظاہرہ کرکے دکھا سکتی ہیں۔ روزنامہ میرا وطن کے نیوز ایڈیٹر، ڈاکٹر محمد قمر تبریز نے سیرت فاطمہ سے فون پر ایک تفصیلی گفتگو کی اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے انھیں کن کن دشوار راہوں سے ہو کر گزرنا پڑا۔ قارئین کے لیے اس گفتگو کے اقتباسات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

س: آپ کی پیدائش کہاں ہوئی اور تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج: میری پیدائش اتر پردیش کے الہ آباد ضلع کے جسرا بلاک کے پنور گاؤں میں ہوئی۔ میں نے اپنی شروعاتی تعلیم اپنے گاؤں سے دور، سینٹ میری کانونٹ اسکول، گھور پور سے حاصل کی۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے ریاضی میں بی. ایس. سی کیا۔ پھر دو سال ایلیمنٹری ایجوکیشن میں ٹیچنگ کی ٹریننگ حاصل کی۔ چھ مہینے بعد جوائننگ بھی ہو گئی تھی۔ میں پرائمری ٹیچر ہوں۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر 20 برس تک گاؤں میں ہی رہی۔ ٹیچنگ جوائن کرنے کے بعد الہ آباد کے کریلی میں رہ رہی ہوں۔ میں بی. ایس. سی کرنے کے لیے گاؤں سے الہ آباد روزانہ بس کے ذریعہ آتی تھی۔ میرا گاؤں یہاں سے 20 کلومیٹر دور ہے۔

س: آپ کے یہاں لڑکیوں کی تعلیم کو لے کر کتنی بیداری ہے اور مسلمانوں کی آبادی گاؤں میں کتنی ہے؟

ج: میرے گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی 500-400 ہے۔ میں اپنے گاؤں کی پہلی لڑکی ہوں، جس نے تعلیم حاصل کی ہے۔ میں پہلی لڑکی ہوں جو پڑھنے کے لیے باہر نکلی۔ مگر میرے بعد بہت سی لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر نکلیں۔ میں اسکول میں ہمیشہ اول رہی۔ جب لوگوں کو پتہ چلا، تو اس سے متاثر ہو کر لوگ اپنی اپنی، چھوٹی بیٹیوں کا داخلہ بھی اسکول میں کروانے لگے۔ ساری بچیاں سینٹ میری اسکول ہی جاتی ہیں، جہاں سے میں نے پڑھائی کی۔ یہ اسکول آس پاس کے 15-10 کلومیٹر کے علاقہ میں سب سے بہتر مانا جاتا ہے۔ میرے گاؤں سے لوگ یہاں مجھ سے ملنے کے لیے اپنی بیٹیوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہے۔ یو. پی. ایس. سی میں میرا انتخاب ہونے کی وجہ سے دوسری لڑکیاں بھی اس طرف توجہ دیں گی۔ ہماری قوم میں لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔

س: آپ شادی شدہ ہیں۔ ایسے میں آپ کے لیے یوپی ایس سی کی تیاری کرنا کتنا مشکل رہا؟

ج: میری شادی ابھی چار مہینے قبل ہی ہوئی ہے۔ میں نے مینس کا پیپر دینے کے بعد شادی کی۔ شادی پہلے سے ہی لگی ہوئی تھی، لیکن میں نے یوپی ایس سی کے لیے والد صاحب سے ایک موقع اور مانگا۔ مجھے معلوم تھا کہ ذمہ داری بہت بڑھ جائے گی۔ پچھلے سال دسمبر میں شادی ہوئی۔ اب پڑھ پانا بہت مشکل ہے، لیکن مجھے اپنی رینک بہتر کرنے کے لیے مزید محنت کرنی ہے۔

س: آپ کے کتنے بھائی بہن ہیں اور والد صاحب کیا کرتے ہیں؟

ج: چار بھائی۔ بہن ہیں ہم۔ میں اپنے گھر میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے والد صاحب پٹواری ہیں۔

س: آپ نے الہ آباد میں رہ کر تیاری کی یا کسی اور جگہ؟

ج: جی! میں نے الہ آباد میں رہ کر پوری تیاری کی، لیکن مینس (Mains) لکھنے کے لیے ہمدرد اسٹڈی سرکل دہلی، کچھ کچھ دنوں کے لیے جاتی رہی۔ میں جتنی بار مینس اور انٹرویو کے لیے گئی ہوں، وہیں ٹھہری ہوں، کیوں کہ وہاں تیاری کا ایک ماحول ملتا ہے۔ لائبریری وغیرہ سے بہت مدد ملتی ہے۔ اس لیے میں اپنی نوکری اور اپنے گھر سے کچھ دن الگ رہ کر وہاں تیاری کے لیے جاتی تھی۔

س: آپ کا سبجیکٹ کیا تھا؟

ج: پبلک ایڈمنسٹریشن (Public Administration)

س: آپ کو کبھی ایسا لگا کہ انٹرویو میں مسلمانوں کے ساتھ جانبداری سے کام لیا جاتا ہے؟

ج: ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ (انٹرویو لینے والے) زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ پچھلی بار بھی میں نے انٹرویو دیا تھا، لیکن 8 آٹھ نمبر کم ہونے کی وجہ سے میرا انتخاب نہیں ہو پایا تھا۔ تب سجاتا میم کا بورڈ تھا۔ تب بھی انھوں نے مجھ سے یہی سوال کیا تھا کہ 'کیا وجہ ہے کہ قوم پیچھے ہے؟' خصوصاً مسلم لڑکیاں کیوں نہیں آگے بڑھ رہی ہیں؟ یہی سوال اس بار کے انٹرویو میں بھی مجھ سے پوچھا گیا۔ پھر میں نے ان کو بتایا کہ پہلی بات تو ان کا معیار کم ہے، مسلمانوں میں اعلیٰ طبقہ نہیں ہے، بلکہ سب متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر سب Lower Middle-class سے ہیں۔ مسلمانوں میں غربت بھی بہت زیادہ ہے، تعلیم کی شرح بھی کم ہے۔ عورتوں کا 47 فیصد، جبکہ مرد 59 فیصد ہی تعلیم یافتہ ہیں۔

س: اس وقت ملک کے جو حالات ہیں، اس تعلق سے بھی سوالات پوچھے گئے؟

ج: طلاق ثلاثہ پر مجھ سے ایک سوال پوچھا گیا تھا۔ میں نے بتایا کہ طلاق ثلاثہ کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ یہ تو اسلام کا حصہ ہی نہیں ہے۔ تعلیم پر اسلام میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ خود حضورؐ نے یہ کہا ہے، "علم حاصل کرنے کے لیے اگر چین جانا پڑے، تو جاؤ۔" میں نے ہر چیز عورتوں کے نظریہ سے بتانے کی کوشش کی، مثلاً لڑکیوں کو اچھی تعلیم دیجیے، ان کی اچھی پرورش کیجیے اور ان کی شادی کر کے انھیں ان کے شوہروں کو سونپ دیں، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ یہ ان کو اچھا لگا۔

انٹرویو بورڈ میں سے ایک شخص نے پوچھا، میں وہاں رہتا ہوں جہاں پانچ طرح کے فرقے ہیں، تو ان کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ میں نے کہا کہ دھیرے دھیرے کچھ تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ اس میں ریفارم کی ضرورت ہے۔ بنیادی طور پر تمام فرقے اللہ کو ایک ہی مانتے ہیں، اس لیے سب کی بنیاد ایک ہے۔ رسول کو مانتے ہیں۔ باقی طریقہ سب کا تھوڑا تھوڑا الگ ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ کیا یہ تبدیل ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا، ہاں! ضرور بدل سکتا ہے۔

اسلام میں چیزوں کو چار طریقے سے دیکھتے ہیں۔ قرآن سے، حضورؐ کی سنت مجلس شوریٰ کے ذریعہ سے اور اجتہاد سے۔ انھوں نے بڑی توجہ سے اجتہاد کا نام سنا اور پوچھا کہ کیا ہے اجتہاد؟ تو میں نے انھیں بتایا کہ جب قرآن، سنت اور اتفاق رائے سے بھی بات نہ بنے، تو ایسی صورت میں اجتہاد کا سہارا لیا جاتا ہے۔ حضورؐ کو ایک بار مصر جانا پڑا، تو انھوں نے کہا کہ میری غیر موجودگی میں اپنی منطقی سوچ کے مطابق کسی مسئلے کو حل کیا جانا چاہیے۔ اجتہاد کے ذریعے اس میں بدلاؤ کیا جا سکتا ہے، اس کی ضرورت ہے۔ یہی سب میں نے ان کو بتایا۔ 1400 سال کے بعد اموی حکومت کے زمانے میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

س: کشمیر اور پاکستان کے تعلق سے کوئی سوال پوچھا گیا؟

ج: کشمیر کے تعلق سے تو نہیں پوچھا گیا، لیکن پاکستان کے تعلق سے سوال ضرور کیا گیا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ پاکستان اور چین ہمیں ہمیشہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں کہ ہم پاکستان اور چین کو کیسے پریشان کر سکتے ہیں؟ بورڈ میں سے ایک شخص روس میں سفیر رہ چکے تھے، تو میں نے جواب دیا کہ میں نے اس تعلق سے کبھی سوچا نہیں۔ لیکن آپ جو یہ سوال کر رہے ہیں کہ کس طرح چین اور پاکستان کو پریشان کیا جا سکتا ہے، تو میں نے کہا کہ ہندوستان ایک ذمہ دار ملک ہے، وہ اس طرح کی کوئی بات نہیں سوچتا۔ ہم پنچ شیل (ناوابستہ ممالک) میں اعتماد رکھتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا Very Claver Answer

س: کوئی ایسا سوال جس نے آپ کو پریشان کیا ہو؟

ج: نہیں، ایسا کوئی سوال نہیں پوچھا۔ وہ پوچھ بھی رہے تھے، تو میں نے اس کا بہت اسمارٹلی جواب دیا۔ میں کافی وقت سے بحث و مباحثہ میں شامل ہوتی رہی ہوں، اس لیے جوابات کو نکال لے گئی۔

س: اپنی تیاری کے بارے میں بتائیے، حالانکہ یہ تو سارے لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے 16 گھنٹے پڑھائی کی۔

ج: میں نے اتنے گھنٹے پڑھائی نہیں کی۔ میں نے صرف 6-7

گھنٹے ہی پڑھائی کی، کیوں کہ میرے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔

س: یو پی ایس سی کی تیاری آپ نے کب سے شروع کی تھی؟

ج: جب میں پہلی بار یو پی ایس سی امتحان میں شامل ہوئی تو میری عمر 21 سال تھی۔ کوئی خاص تیاری نہیں کی تھی۔ میں اس امتحان میں شامل ہونے کے لیے بہت پرتجسس تھی۔ تب میں ٹریننگ کر رہی تھی۔ 2015 کے امتحان پر بھی میں زیادہ وقت نہیں دے سکی اور 15-2014 میں بھی زیادہ سنجیدگی سے پڑھائی نہیں کی تھی۔ میری ٹریننگ گھر سے بہت دور چل رہی تھی، اس لیے بالکل وقت نہیں مل پا رہا تھا۔ ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد جوائننگ میں تھوڑا وقت لگ گیا۔ 16-2015 کا ایک سال کا وقت گھر پر بیٹھ کر پڑھائی کرنے کے لیے مل گیا۔ اس کے بعد 2016 میں جوائننگ کے بعد اسکول جانے لگی۔ اسکول آنے جانے کے باوجود چار-پانچ گھنٹے پڑھائی کے لیے نکال لیتی تھی۔ جس مہینے میں میری جوائننگ ہوئی، اسی مہینے میرا پری امتحان تھا۔ میں نے پری امتحان کوالیفائی کیا۔ مینس امتحان میں بھی کامیابی ملی، لیکن انٹرویو میں نمبر کم ہونے کی وجہ سے یو پی ایس سی میں سلیکشن نہیں ہو پایا۔ پھر رزلٹ کے 15 دن بعد میرا اگلا پری امتحان ہونے والا تھا۔ میں پھر اس کی تیاری میں لگ گئی۔ پھر پری، مینس پاس کرتے ہوئے آج یہاں تک پہنچی ہوں۔ تو پھر بات وہی ہے کہ 16 گھنٹہ پڑھنا، یہ ضروری نہیں ہے، بلکہ 6-5 گھنٹے پڑھ کر بھی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جتنا کم وقت رہے گا، اتنی ہی زیادہ کوشش و محنت ہوگی۔ بس ایسے ہی پڑھائی کی میں نے۔

س: خاص فوکس سبجیکٹ وغیرہ کے تعلق سے؟

ج: مجھے اپنے آپشنل میں زیادہ دلچسپی ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ تھوڑا سا جی ایس (جنرل اسٹڈیز) میں بھی یہ کام آجاتا ہے، اس لیے میں نے اپنا آپشنل پبلک ایڈمنسٹریشن رکھا، کیوں کہ میں نے بی ایس سی میتھ سے کیا ہے۔

س: میں سمجھ سکتا ہوں کہ زیادہ تر دشواری بچوں کو جی ایس میں ہوتی ہے۔ اس کی تیاری آپ کیسے کرتی تھیں؟

ج: بات یہ ہے کہ میں نے صرف ایک ہی کتاب رکھی، ایک ہی سورس رکھا۔ جیسے مجھے قدیم تاریخ (Ancient History) پڑھنی ہے، تو میرا ایک ہی سورس ہے، این سی ای آر ٹی کی پرانی کتابیں۔ مجھے کلچر رکھنا ہے، تو میرا ایک سورس اسپیکٹرم ہے۔ مجھے ماڈرن انڈیا کرنا ہے، تو میرا ایک ہی سورس ہے، بپن چندرا۔ میں نے ایک چیز کو ایک ہی جگہ سے پڑھا۔ میں نے ہر چیز کا نوٹس بنایا۔ پری امتحان کا تو اتنا پتلا نوٹ ہے کہ 32 صفحات میں پورا اسلیبس کور کیا ہے۔ ہسٹری، اکنامکس اور جغرافیہ۔ تو اس طرح کے نوٹس Prelims کے لیے بنا لینا چاہیے، تاکہ وہ ریویزن میں کام آئے۔ پری امتحان میں مقابلہ سخت ہوتا ہے۔ باقی کے لیے اخبارات، کبھی کبھی کچھ اچھی چیزیں اپنی پرسنل ڈائری میں لکھ لیتی ہوں۔ میل وغیرہ پر بھی اچھی چیزیں رکھ لیتی ہوں، جس سے جواب لکھنے میں آسانی ہو۔ پیپر اچھے سے پڑھتی تھی اور بہت ساری چیزیں Prelims میں ہی کور ہو جاتی ہیں۔ تھوڑا بہت میگزین وغیرہ جیسے فرنٹ لائن دیکھ لیا۔ اگر کچھ ای پی ڈبلیو (اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی) میں آیا تو اس کو دیکھ لیا۔ مینس امتحان کے لیے اہم ہے تو اس کی فوٹو کھینچ لی یا پھر پرنٹ آؤٹ کروا کر رکھ لیتی تھی۔ یو پی ایس سی کے امتحان کے لیے سب سے اہم مضمون نگاری (Essay) ہے، جو 250 نمبروں کا ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بچوں کو اس پر زیادہ فوکس کرنا چاہیے۔ ویسے بھی مجھے 149 نمبر ملے تھے جو بہت اچھے مانے جاتے ہیں۔ اس لیے Essay پر خصوصی توجہ دینی چاہیے، جو نمبرات ادھر اُدھر سے کم ہوتے ہیں وہاں سے پورے ہو جاتے ہیں۔ تھوڑا سا دنیا کو بھی جاننا چاہیے۔ کنویں کے مینڈک نہ ہوں۔ کبھی کبھی کچھ چیزیں ایسی مل جاتی ہیں، جب انھیں مضمون میں ڈالو تو دیکھنے میں بہت ہلکا پھلکا لگتا ہے۔ ایسا نہیں لگتا کہ آپ کہیں سے چھاپ رہے ہیں۔ اس لیے Essay پر فوکس کرنا چاہیے۔

باقی آپشنل پر فوکس تو کرنا ہی چاہیے اور ایتھکس جو یو پی ایس سی میں ابھی نیا شامل ہوا ہے، اس کے لیے کوئی تیاری کی ضرورت نہیں ہے۔ ایتھکس طے شدہ وقت میں کرنا ہوتا ہے اور یہ کہیں سے پڑھی نہیں جاتی، بلکہ یہ اپنے اندر سے آتی ہے۔ اور جب آپ کے پاس وقت کم ہو، تو اس کو کم وقت میں نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے اپنے کو تیار کرنا پڑے گا، اس کیلئے سوچنا پڑتا ہے، تبھی جواب دے سکتے ہیں۔

تو بس یہی ہے سب۔ ہاں انٹرویو کے لیے یہ ضروری ہے کہ گہرا مطالعہ ہو۔ انٹرویو میں کبھی بھی بورڈ کے لوگوں کو اپنے شکنجے میں لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ وہ بہت اسمارٹ ہوتے ہیں۔ میں نے ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے، جو بہت ذہین ہیں، لیکن کچھ ایسی غلطی کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بورڈ کے اسمارٹ لوگ انٹرویو میں انھیں پریشان کرنے لگتے ہیں، وہ ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر پھنسانے لگتے ہیں۔

چلئے، بہت بہت شکریہ اور یہ کامیابی آپ کو بہت مبارک ہو۔

Mohd Qamar Tabrez
352-E (Deshraj Tokas Building)
R. No. 13-14 (Third Floor),
Munirka Village, Near JNU,
New Delhi-110067

افروز عالم ساحل

اپنی مٹی میں رہ کر کچھ کرنے کا خیال سول سروس کی وجہ بنا

بیرون ملک اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے والی علمہ افروز کو اپنی مٹی نے جب آواز دی تو خود کو روک نہیں سکیں اور نیو یارک سے پرکشش تنخواہ والی نوکری چھوڑ کر ملک کی خدمت کے جذبہ کے ساتھ اپنے وطن لوٹ آئیں۔ علمہ کی کہانی ان سب باتوں سے بھی کہیں اوپر ہے۔ علمہ ان نوجوانوں کے لیے ایک بہترین مثال ہیں، جن کے والدین کسان ہیں یا جو یتیم ہیں۔ علمہ نے اس بار یو پی ایس سی کے سول سروس کے امتحان میں 217 ویں رینک حاصل کی ہے۔ علمہ کے بقول میری اس کامیابی میں سب سے اہم رول میرے چھوٹے بھائی (عرفات افروز) کا ہے۔ میرا بھائی عام بھائیوں کی طرح نہیں جو مجھے کہے کہ جا کر آلو پیاز کاٹو۔ کچن سنبھالو۔ میں نے کہا کہ مجھے پیرس جانا ہے، تو اس نے جیسے تیسے کر کے مجھے پیرس بھیجا۔ میں جو بھی ہوں، اپنے بھائی کی وجہ سے ہوں۔ عرفات مجھ سے 3 سال چھوٹا ہے اور اس نے دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج سے بی اے (آنرس) سنسکرت کیا ہے اور ان دنوں سول سرویسز کی تیاری میں مصروف ہے۔

مرادآباد کے کندرکی میں پیدا ہونے والی 26 سالہ علمہ کی عمر جب محض 14 سال تھی، تب ان کے والد قاضی افروز گزر گئے۔ پھر ان کی ماں سہیلہ پروین نے انھیں پڑھایا لکھایا اور علمہ دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج پہنچ گئیں۔ ان کی دسویں تک کی پڑھائی کندرکی میں ہی ہوئی ہے۔ پھر مرادآباد کے ویلسونیا انٹر کالج سے انٹر کی پڑھائی مکمل کی۔ سینٹ اسٹیفن سے بیچلر ڈگری حاصل کرنے کے بعد علمہ ایک ایکس چینج پروگرام کے تحت پیرس گئیں۔ پھر آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھائی کی۔ پڑھائی مکمل ہونے کے بعد اقوام متحدہ، انڈونیشیا کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ پھر نیو یارک چلی گئیں۔

علمہ بتاتی ہیں کہ جب میں پیرس جارہی تھی، تب میری ماں بہت تیز دھوپ میں کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ ہوائی جہاز میں میں یہ سوچ رہی تھی کہ اے سی کی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھی ہوں، امی بہت ہی سخت سورج کی تپش میں کام کر رہی ہوں گی۔ پیرس کے طرز زندگی کو فالو کرتے ہوئے بھی میں گھر کے بارے میں سوچتی رہی۔ آکسفورڈ اور نیو یارک کی چکا چوند میں بھی یہ سوچتی رہی کہ میں نے اپنی زندگی تو 'سیٹ' کر لی، لیکن ان لوگوں کو کیا ملا، جنھوں نے نہ جانے کتنی مصیبتیں جھیل کر مجھے پڑھایا ہے۔ انھیں تو کچھ نہیں ملا۔ ان کی زندگی کا انداز آج بھی وہیں کا وہیں ہے۔ وہی مچھر، وہی بجلی کا مسلسل غائب رہنا، اس کا احساس مجھے ہمیشہ رہا۔ وہ یہ کہتے کہتے بہت جذباتی ہو گئیں، بتاتی ہیں کہ 'میں جب بیچ بیچ میں گھر آتی تھی تو وہ میرے طرف دیکھتے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک میں کبھی نہیں بھول سکی۔ مجھے یہ لگا کہ ان کی آنکھوں میں یہ چمک اس لیے بھی ہے کہ انھیں لگ رہا ہوگا کہ میں اپنی تعلیم سے ان کی زندگی کے مسائل کو کچھ کم کر دوں گی۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ ان سے دور رہ کر نیو یارک میں غیر ملکی کمپنیوں کی ملازمت کر کے تو مسائل ختم نہیں ہونے والے ہیں۔ تو مجھے لگا کہ میری جگہ بس اسی ملک کی مٹی میں ہے۔ مجھے اپنی مٹی میں رہ کر ہی کچھ کرنا چاہیے۔ علمہ کہتی ہیں کہ میرے گھر میں مٹی کا احساس بڑا گہرا ہے۔ جب اس مٹی سے نکلی فصل بازار میں بکتی تو میری کتابیں آتی تھیں۔ یہ مٹی، یہ زمین میرے ذہن میں اس قدر بسی ہوئی ہے کہ میں اسے چھوڑنا تو دور، اس کے بغیر رہنے کی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہیں سے میں نے سول سروس میں جانے کا سوچا۔ اپنے وطن واپس لوٹی اور پھر سول سروس کی تیاری شروع کر دی اور اب میں سول سرونٹ ہوں۔ علمہ کی امی اب بھی کھیتی کرتی ہیں۔ علمہ کہتی ہیں کہ، امی نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ہمت سے اپنے راستے پر لگی رہو۔ پیسے تو ہمارے پاس تھے نہیں، بس اللہ کا سہارا تھا۔ کالج کے دنوں سے ہی مجھے اسکالرشپ ملتی رہی اور میں پڑھتی رہی۔ اپنا خرچ چلانے کے لیے ڈبیٹ میں حصہ لیا کرتی تھی۔ آج میں کہہ سکتی ہوں

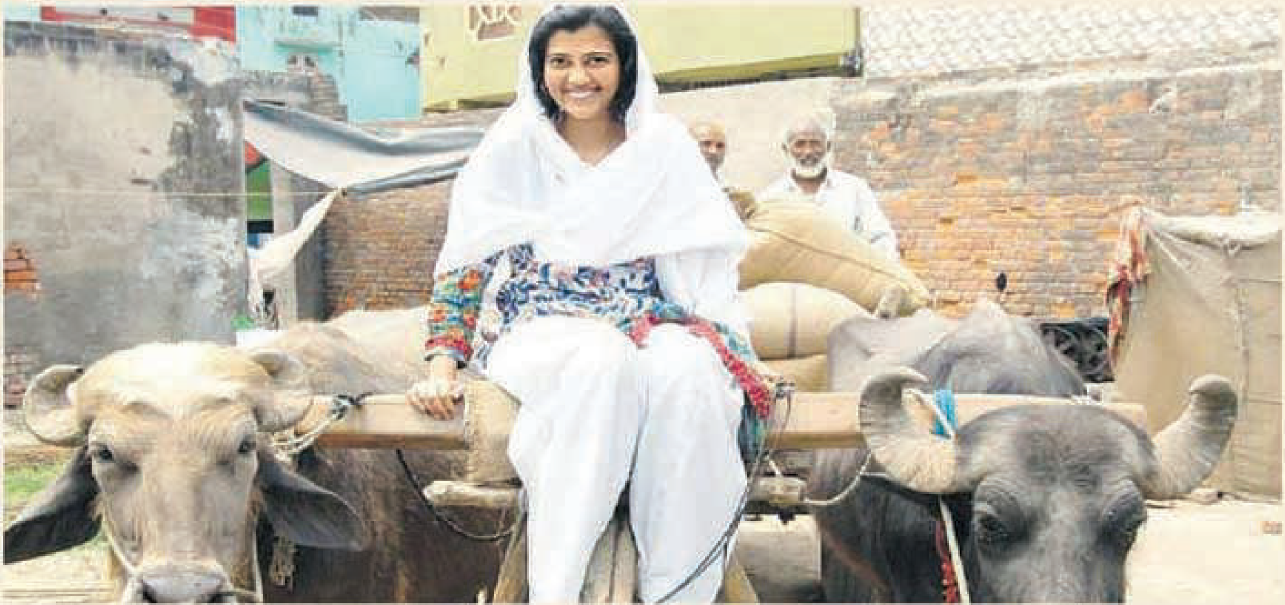

کہ اس وجہ سے میں انٹرنیشنل ڈیبیٹر ہوں۔

علمہ نے بطور سبجیکٹ فلاسفی کو منتخب کیا۔ وہ بتاتی ہیں کہ سینٹ اسٹیفن میں میں نے بی اے (آنرس) فلاسفی کی ہے۔ یہاں اساتذہ نے مجھے اتنا اچھا پڑھایا تھا کہ فلاسفی سے بہتر کچھ لگا ہی نہیں۔ اس کے لیے اپنی پوری زندگی اپنے استاد کا شکریہ ادا کروں تو بھی ان کا قرض نہیں اتار سکتی۔ مجھے آگے بڑھانے میں فلاسفی ٹیچر کا بہت اہم رول رہا ہے۔ علمہ کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق رہا ہے۔ آپ 'ڈیلی او' اور 'ٹو سرکل ڈاٹ نیٹ' وغیرہ ویب سائٹوں کے لیے لکھتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ علمہ کو کاشتکاری میں بہت دلچسپی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اگر میں گھر میں ہوں تو اپنے کھیتوں کو دیکھتی ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اپنے کھیتوں کو دیکھ کر ہی ملتی ہے۔ کھیتی میں بہت کچھ ہے، بس آپ کو کچھ ٹرکس اپنانے کی ضرورت ہے، پھر آپ کی آمدنی دگنی ہوگی۔ میں نے اپنے بچپن میں بابا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرے کھیتوں میں شہد کی پیٹیاں رکھی ہیں اور ہم کئی طرح کی فصلیں بھی اگاتے ہیں۔

علمہ کہتی ہیں کہ، بننا تو آئی اے ایس تھا۔ لیکن مجھے اس رینک پر آئی ایف ایس مل سکتی ہے، مگر میں اب پولیس سروس میں جانا چاہتی ہوں، تو میں آئی پی ایس بن کر ہی ملک کی خدمت کروں گی۔ ان کا بھی کہنا ہے کہ ہندوستانی آئین کے تحت مجھے جو بھی ذمہ داری سونپی جائے گی، میں مکمل دیانت داری کے ساتھ اس پر عمل کروں گی۔ میری ترجیح ہمیشہ یہ رہے گی کہ میں اپنا فرض اچھی طرح نبھاؤں۔

سول سروس امتحان کی تیاری کے بارے میں پوچھنے پر بتاتی ہیں کہ، میں نے الگ سے اس کی کوئی خاص تیاری نہیں کی۔ اس کے لیے میری اب تک کی تعلیم بہت کام آئی ہے۔ میں یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ بجائے کوچنگ کے خود پر بھروسہ کریں۔ مجھے نہیں لگتا کہ کوچنگ میں پڑھ کر کوئی آئی اے ایس ہو سکتا ہے۔ آئی اے ایس بنے گا تو اپنی محنت سے، اپنی ہمت سے۔ کوچنگ کے لیے دہلی کے راجندر نگر یا مکھر جی نگر میں رہنا ہی ایک سزا ہے۔ اسی لیے میرے چھوٹے بھائی نے بھی کوچنگ جوائن نہیں کی ہے۔ وہ بھی میری طرح لائبریری میں بیٹھ کر خود سے تیاری کر رہا ہے۔ سول سروس کی تیاری کرنے والوں کو اپنا پیغام دیتے ہوئے علمہ کہتی ہیں کہ یہاں کامیابی ناکامی سب ملتی ہے۔ تو سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اپنے والدین، اپنے بھائی بہنوں سے الگ نہ ہوں۔ ہر روز ان سے بات کیجیے۔ انھیں پورا وقت دیجیے۔ اس سے آپ ذہنی طور پر مضبوط رہیں گے اور اس کا فائدہ آپ کو مینس لکھنے اور انٹرویو دونوں میں ملے گا۔ آپ کبھی ڈپریشن کا شکار نہیں ہوں گے۔ اور ہاں، خود کو سوشل میڈیا، موبائل اور ٹی وی سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔ اپنی محنت پر اعتماد رکھیے، انشاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

علمہ کے بقول ہم سب بھی اسی ملک کی مٹی میں پیدا ہوئے ہیں۔ اسی مٹی میں جئیں گے اور مریں گے۔ اس سے ہم سب کو بہت محبت ہے۔ اور ہم ہمیشہ اس کی خدمت کریں گے۔ یہ سوچ آج ہر مسلم نوجوان کی ہے۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ سول سروس کی جانب بڑھیں۔ اب ہمیں تھوڑا بڑا خواب دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم بڑا خواب دیکھیں گے اور اسے حاصل کرنے کے لیے سخت محنت کریں گے تو پھر کچھ بھی ممکن ہے۔

(بشکریہ روزنامہ انقلاب، ممبئی)

شاعرات کے منتخب اشعار

کہیں کہیں پہ ابھی تک، مری زمین ہے خشک
برسنا چاہے جو بادل اسے دکھا دینا

میں کیا کروں کہ وفاؤں کا ہو یقیں اس کو
یہ میرے اشک یہ کاجل اسے دکھا دینا
(قمر سرور)

چاند سے کیا غرض مجھے پھول سے واسطہ کسے
دل ہے اس پر رنگ و بو سینۂ داغدار میں

ایک بہار زخمِ دل ایک وفورِ اشک تر
چشمۂ آب ہے رواں پہلوئے لالہ زار میں
(بلقیس جمال)

بھلا کیا فکر اس کو نیند کی ہو
جسے کروٹ بدلنا آ گیا ہے

ہنر تو سیکھ لیں گے وقت سے اب
ہمیں سورج سا ڈھلنا آ گیا ہے
(ڈاکٹر بھاؤنا)

قفس میں رہنے والا ہر پرندہ
اڑانیں بھرنے سے اب ڈر رہا ہے

یہ کیسی زندگی ہے، اندر اندر
ہر اک انسان ہر پل مر رہا ہے
(سلمیٰ صنم)

تمھارے پہلو میں گزرے تھے جو کبھی آ کر
کہ چل پڑے وہی لمحے تمھارے گھر کی اور

سلگتی پیاس کو جن بادلوں نے سینچا تھا
ہمیں وہ لے ہی گئے تھے تمھارے گھر کی اور
(ڈاکٹر آرتی کماری)

کنارِ آب شکستہ سی کشتیوں کی طرح
پڑے ہوئے ہیں ہم ویران بستیوں کی طرح

شہر در شہر بھٹکتے ہی رہے عمر تمام
کیا ترے ہاتھ کی ریکھاؤں میں آرام نہیں
(حسنیٰ سرور)

ہوا ہے قتل مرا وارثوں کے ہاتھوں سے
کرے گا کون طلب کس سے خوں بہا میرا

ہم کہ خود ساختہ زنجیروں کے دیرینہ اسیر
در زنداں بھی کھلا پائیں تو جائیں گے کہاں
(ناہید اختر)

کسی سراب کی زرد میں ہر ایک ساحل ہے
میں جانتی ہوں کہ خود ریت کے بھنور میں ہوں

بہا کے لے گیا سیلاب راستے جن کے
وہ شہر اپنے خیالوں میں اب بھی بستے ہیں
(وفا لکھنوی)

خالہ شبو

نور جہاں

پچھلے پچیس تیس برسوں میں زندگی نے اتنی کروٹیں لی ہیں کہ ہماری معاشرت کا پورا ڈھانچہ ہی کچھ کا کچھ ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ صرف شہروں بلکہ قصبوں اور گاؤوں کی زندگی بھی ایک مسلسل دوڑ اور ہنگامہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس دوڑ میں ہمیں جہاں زندگی کی بہت سی نعمتیں اور آسائشیں میسر ہوتی ہیں وہیں اس نے دوسری کئی چیزوں کے ساتھ ہم سے فارغ الوقتی بھی چھین لی ہے۔ اب کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ مشاطاؤں کی لچھے دار باتوں میں گھنٹوں کھویا رہے۔ ان کی لچھے دار باتوں میں گھنٹوں کھوئے رہنے کی بات تو دور رہی خود مشاطہ ہی نہ جانے کہاں اڑن چھو ہو گئی ہے؟ شاید بناؤ سنگھار کے مشینی آلات نے اسے نگل لیا ہے۔ مانا کہ آج ہماری سنگھار میز کے ساتھ ہی رکھے ہوئے بینگلز بکس میں رنگا رنگ چوڑیوں کے دسیوں سیٹ ہوتے ہیں مگر اب وہ حسین تصور کہاں جو منیہارن کے ساتھ وابستہ تھا۔ منیہارن تو اب بس ایک کہانی بن کر رہ گئی ہے۔ نئی نسل کو شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ محلے یا گھر میں شادی یا بیاہ یا تہوار کے موقع پر منیہارن کی آمد ہمارے لیے کتنی بڑی خوشی کی بات ہوتی تھی۔ یہ بات دوسری ہے کہ چوڑیاں ہمیں بزرگوں کی ہی پسند کی پہننی پڑتی تھیں۔ اب تو ہم مالن کو بھی ترس گئے ہیں۔ بیلے اور چمیلی کے اُن گجروں کی مہک ہمارے احساس میں آج بھی بسی ہوئی ہے جو تہوار یا شادی بیاہ کے موقعوں پر ہمیں بچپن میں بھی مل جایا کرتے تھے اور پھر شادی کے بعد تو برسوں تک دلہن کو پھول اور گجرے پہنچانا مالن کا فرض ہوتا ہی تھا۔ مشاطہ، منیہارن یا مالن کی بات چھوڑیے، اب تو ہماری خالہ شبو بھی نہیں رہیں۔

مالن اور منیہارن کی شکلوں کا تو اب صرف ایک دھندلا سا ہیولا ہی باقی رہ گیا ہے۔ مگر اللہ بخشے خالہ شبو ہمارے تصور میں اب بھی اسی طرح زندہ ہیں جیسے اب سے بیس برس پہلے تھیں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پان کی پیک سے گلکاری کیا ہوا برقعہ ڈالے خالہ شبو ہمارے دروازے کا پردہ ہٹا کر بس پوچھنے ہی والی ہیں کہ بٹی جتو سب خیریت تو ہے نا! وہ اس طرح پہلے تو خیریت دریافت کرتیں اور ادھر سے گرم جوشی کا اظہار ہونے پر یا پھر اپنی غرض سے وہ لفو لفو جوتی گھسیٹتی صحن میں داخل ہو جاتیں۔ وہ روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن ضرور آتیں اور آنے کی وجہ صرف تین باتیں ہوتی تھیں۔ یا تو اپنے اکلوتے لڑکے سے کوئی اذیت پانے پر بلبلا کر گھر سے نکل پڑتی تھیں، جب اس طرح آتیں تو گھنٹوں کے لیے چھٹی ہو جاتی تھی۔ پہلے تو اپنے جل موہے لڑکے کو طرح طرح سے کوستیں اور اپنا سینہ پیٹتی رہتی۔ اور پھر کسی نہ کسی بیونت سے بات کھانے پینے تک جا پہنچتی۔ جس کا واضح مطلب یہی ہوتا کہ اب خالہ شبو کے ذہن کی سوئی معدے میں اٹک گئی ہے۔ ان کے آنے کی دوسری بڑی وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ ساری آبادی کی خیر خبر رکھنے کا بھی دم بھرتی تھیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ پوری آبادی میں کسی کا ماتھا بھی گرم ہو اور خالہ شبو فوراً نہ پہنچیں۔ وہ اپنی اس عادت سے تقریباً مجبور سی تھیں اور اپنی اس عادت کی بدولت وہ چلتا پھرتا اخبار بھی کہلانے لگی تھیں۔ کل شام کس کے گھر کیا پکا تھا، شیخ فتو نے آج پھر اپنی زبان دراز بیوی کی ٹھونکا پیٹی کر دی ہے، خضاب کے لیے پیسے مانگنے پر جھگن چچا کا اپنی بیوی سے چار دن پہلے جو جھگڑا ہوا تھا ان کی آپسی بول چال ابھی تک شروع نہیں ہوئی ہے، اچھن میاں کی بیوی کبھی واپس لوٹ کر نہ آنے کی دھمکی دے کر ایک بار پھر میکے چلی گئی ہے، اور تو اور، خالہ شبو کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ روحی کے میاں کا اپنی پڑوسن سے کوئی چکر چل رہا ہے اور یہ کہ، نعیمہ کا پانچویں بار پیر بھاری ہو کر ایک بار پھر امیدوں پر

اوس پڑ گئی ہے۔ دلچسپ بات تو یہ تھی کہ یہ راز کی بات خالہ شبو کے سینے تک ہی محدود نہیں رہتی تھیں بلکہ ان کی شہر گردی کے طفیل سینہ در سینہ دوسری تمام بیبیوں تک بھی آناً فاناً پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی وہ ایسے چکروں کا ذکر اس چٹخارے کے ساتھ کرتیں کہ انھیں اپنے یہاں سے جانے دینے کو طبیعت نہیں چاہتی تھی۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ خالہ شبو کی ایک بڑی خوبی یا خامی یہ تھی کہ جہاں دو ناراض پڑوسنوں میں صلح صفائی کرا دینے میں طاق تھیں وہی دوست سے دوست پڑوسنوں کے درمیان منٹوں میں فساد کھڑا کر دینے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں تھیں، ان کے من سے اگر کوئی اترا یا کسی نے انھیں کوئی ایسی بات کہہ دی جو ان کو ناگوار گزری تو اس کا بدلا ضرور لیتیں اور اس طرح لیتیں کہ کسی کو گمان تک نہ گزرتا کہ اس آفت کے پیچھے خالہ شبو کا ہاتھ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری سہیلی ریحانہ نے ایک بار انھیں چھیڑتے ہوئے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ خالہ کبھی تو اپنے گھر بھی بیٹھا کرو۔ بس کیا تھا اس وقت تو وہ کچھ یوں ہی سا منہ بنا کر اٹھ آئی تھیں مگر بعد میں ریحانہ کے خلاف اس طرح مہم چلائی کہ بے چاری کی اپنی کئی پڑوسنوں سے بول چال تک بند کرا دی۔

اگر انھیں کسی سے بدلا لینا ہوتا، یا پھر یوں ہی ادھر کی بات اُدھر کرنے کی خواہش زور مارتی، تو کسی نہ کسی بہانے آ دھمکتیں۔ اِدھر اُدھر کی بات کرنے اور کچھ اپنی پریشانیاں بیان کرنے کے بعد بڑے رازدارانہ انداز میں کہتیں کیوں بی جمو! کیا آج کل ریحانہ سے کچھ کھٹا کا چل رہا ہے؟ جواب نفی میں ملنے پر کہتیں نہیں میں تو بس اس لیے پوچھ رہی تھی اسے بہت دنوں سے تمھارے ہاں نہیں دیکھا۔ پھر وہ بات آگے بڑھاتے ہوئے کہتیں لو اِبی جمو! میری تو مت ہی ماری گئی ہے، میں تو تم سے ایک بات کہنا ہی بھول گئی، سنا ہے کہ نجو بوا کو تم سے بہت شکایت ہے۔ فطری طور پر سوال یہی ہوتا کہ، کیوں انھیں مجھ سے کیا شکایت ہوئی؟ تو خالہ شبو کہتیں کہ سنا ہے تم نے پرسوں انھیں بالکل ٹھنڈی اور دیر کی پکی ہوئی چائے پلائی تھی۔ نجو بوا میں اور مجھ میں ناچاقی پیدا کر دینے کا اُن کا یہ ایک آسان سا طریقہ تھا۔ جب کچھ دن بعد بات کھلتی کہ یہ سب آگ خالہ شبو کی ہی لگائی ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو اس طرح صاف نکال لے جاتیں کہ ہمیں خود کو ہی ندامت ہوتی۔ آخر میں تو لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ دو گھروں میں کوئی ناچاقی یا دو پڑوسنوں میں کوئی تکرار ہوئی ہے تو اس میں کہیں نہ کہیں خالہ شبو کا ہی ہاتھ رہا ہوگا۔

مانا کہ خالہ شبو ادھر کی بات اُدھر کرنے میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتی تھیں مگر وہ دل کی بری بھی نہیں تھیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا پورا اور صحیح نام کیا تھا؟ بڑوں سے سنا تھا کہ ان کا بچپن سے ہی شبو نام تھا۔ اسی آبادی میں پیدا ہوئیں اور ماں باپ نے اسی آبادی میں دیکھ بھال کر شادی کر دی تھی اور پھر وہ اسی جگہ کی خاک کا پیوند بھی ہو گئیں۔

■■■

فرہنگ آصفیہ سے

اودبلاؤ کی ڈھیری - ہ۔ اسم مؤنث۔ وہ جھگڑا جو کبھی فیصل نہ ہو۔ (اس کا قصہ یوں مشہور ہے کہ جب کئی اودبلاؤ مل کر مچھلیاں مارتے ہیں تو وہ دریا کنارے لا کر ڈھیر کرتے اور ہر ایک کا الگ الگ حصہ لگاتے ہیں جب حصہ لگا چکتے ہیں تو ایک نہ ایک اودبلاؤ اپنے حصہ کو کم سمجھ کر سب کو گڈمڈ کر دیتا ہے اور اسی طرح یہ جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ پس اسی وجہ سے جو بات کبھی فیصل نہ ہو اسے اودبلاؤ کی ڈھیری کہتے ہیں۔

بارتنگ - ف۔ اسم مذکر۔ پراکرت۔ (بارتنگیت) ایک دوا کا نام جس کا بیج بکری کے بچہ کی زبان سے مشابہ اور مزاجاً دوسرے درجہ میں سرد خشک ہے۔

بارجہ - ہ۔ اسم مذکر۔ برآمدہ۔ کوٹھا۔ اٹاری۔ (بظاہر یہ لفظ اصل (باہر جا) سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔ یعنی بالاخانہ کے آگے کا سایہ دار چھجا۔ لیکن عرف عام میں بارجہ مشہور ہے اسی بہانے بوز اسکا املا قرار دیا گیا ہے۔

بارد - ع۔ صفت۔ ٹھنڈا۔ سرد۔ سیتل۔ خنک۔

باؤلی - ف۔ اسم مؤنث (۱) ایک لمبا اور چوڑا کنواں جس میں سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں۔ بائیں (۲) تُرکی میں تیار ہوئے جانور شکاری۔ وہ چیز جس سے پرندوں کو شکار پکڑنا سکھاتے ہیں (ہندی) پاگل عورت (۲) فریب۔ چال۔ دھوکہ۔

بدرقہ - ع۔ اسم مؤنث (۱) رہبر۔ رہنما (۲) ہم سفر (۲) اطبا کی اصطلاح میں وہ دوا جو کسی دوا کی معاون اور مددگار ہو۔ مدد۔ وسیلہ۔ انوپان۔ بدل۔ بچائے (۲) سپاہ۔ محافظ۔ نگہبان۔ طلایہ۔ رونق۔

خورشید جہاں

من کہ............

پڑھنے اور ڈگریاں حاصل کرنے کا شوق کسے نہیں ہوتا مگر اس کے لیے جس دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے بس سے باہر کی بات تھی۔ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ کتاب ہاتھ میں لوں اور سب کچھ فرفر زبانی یاد ہو جائے۔ لیکن میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ دماغ میں تو بھوسا بھرا تھا۔ کسی طرح مڈل پاس نہ ہو سکی۔

آج سے تیس پینتیس سال پہلے نظام تعلیم اس قدر ناقص تھا کہ جب تک ایک ایک درجے میں پورے بارہ مہینے تک کتابوں سے آنکھیں نہ پھوڑو اور ہر تین مہینے پر ایک امتحان نہ دو تب تک دوسرے کلاس میں جانا نصیب نہ ہوتا۔ میرے ساتھ تو اور بھی زیادتی ہوتی تھی کہ دو دو سال میں ایک جماعت پاس ہونے دیا جاتا تھا۔ جس سے میں تنگ آ گئی تھی۔ آخر چند ہی برسوں میں بغیر مڈل پاس ہوئے گھر آ بیٹھی۔ اتنے دنوں میں شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ ماں باپ نے اچھا رشتہ دیکھ میری شادی کر دی۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی میں اتنی دقت نہ تھی۔ لڑکے اپنی بیوی کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہ سمجھتے تھے بلکہ جاہل ہونا ہی لڑکیوں کے شریف اور سگھڑ ہونے کی دلیل تھا۔

میرے شوہر کا سرکاری آفیسر تھے۔ شادی سے پہلے انھوں نے سن رکھا تھا کہ میں اسکول میں پڑھتی ہوں۔ انھوں نے غالباً مجھے تعلیم یافتہ سمجھ کر شادی کی تھی اور اب ان کا اصرار تھا کہ میں تعلیم جاری رکھوں۔ میں ابھی بہانے ہی ڈھونڈ رہی تھی کہ قدرت کی طرف سے انتظام ہو گیا۔ میرے ماں بننے کے آثار جیسے ہی نمایاں ہوئے، میرے شوہر پڑھائی لکھائی کی بات بھول کر میری ناز برداریوں میں لگ گئے۔

یہ بہانہ ایسا کامیاب تھا کہ برسوں میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ فیملی پلاننگ والے پیچھے پڑ گئے۔ شوہر کی کثیر آمدنی بھی اب بچوں کے خرچ کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگی تھی۔ جس سے میں خود پریشان تھی۔ سوچا اب تک میاں مجھے پڑھانے لکھانے کا ارادہ ترک کر چکے ہوں گے کیوں نہ آپریشن کے ذریعے ہر سال کے اس جنجال سے چھٹکارا پا لیا جائے۔

بچوں کی آمد کے رکتے ہی میاں کا شوق پھر ابھر آیا۔ اب وہ صرف شوقیہ نہیں بلکہ ضرورتاً مجھے تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنے دنوں میں زمانے کی ہوا بدل چکی ہے اور تعلیمی نظام میں بہت سے سدھار ہوئے ہیں۔ مثلاً جس نے مڈل تک بھی نہ پڑھا ہو وہ میٹرک میں پرائیوٹ طور پر نہ صرف شامل ہو سکتا ہے بلکہ نہایت آسانی سے فرسٹ ڈویژن لا سکتا ہے اور اپنی عمر جتنا جی چاہے کم کر کے لکھوا سکتا ہے — اگر آپ کو امتحان کے سوالات سمجھ میں نہ آتے ہوں تو آپ اپنے پرائیوٹ ٹیوٹر یا گارجین کی مدد سے انھیں حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کے گارجین کو سوالات حل کر کے آپ کے لیے امتحان ہال میں بھجوانے کی چھوٹ ہے۔ جنھیں آپ بہ آسانی نقل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ میں پرچیاں نقل کرنے کی بھی صلاحیت نہ ہو یعنی لکھنا بھی نہ آتا ہو تو آپ کی طرف سے کوئی بھی دوسرا آدمی امتحان دے سکتا ہے۔

اتنے پر بھی اگر آپ کی کامیابی مشکوک ہے تو کلرک کو کچھ کھلا پلا کر معلوم کروائیے کہ کاپیاں کہاں جانچی جا رہی ہیں۔ یہ معلوم کروانے کا کام بھی اسٹوڈنٹ کا نہیں بلکہ اس کے گارجین کا ہے اسٹوڈنٹ کا کام صرف امتحان میں کسی طرح شامل ہو جانا ہے۔ بقیہ آپ کے گارجین دیکھ لیں گے۔ امتحان سے پہلے بھی اور بعد میں بھی آپ بے فکر ہو کر سکھ کی نیند سوئیے۔ جاگنا اور فکر کرنا آپ کے گارجین کا فرض ہے، بھاگ دوڑ اور پیسے خرچ کرنا ماں باپ یا شوہر کا فرض اور فرسٹ ڈویژن لا کر مبارک بادیاں اور تحسین و آفرین کے کلمات وصول کرنا آپ کا حق۔ ہاں تو جیسے ہی اکزامز کا پتہ معلوم ہو جائے ویسے ہی خط اور آدمی اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے یہاں دوڑائیے تا کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر نمبر بڑھوانے کا انتظام کر سکیں۔ اس میں جو بھی خرچ ہو دریغ نہ کیجیے۔

جب ان مراعات کا مجھے علم ہوا تو جاگتے میں سنہرے سپنے آنے لگے۔ فارم بھرا گیا۔ نصاب کی ساری کتابیں گھر آ گئیں۔ ایک استاد رکھا گیا جو ان کتابوں سے نوٹ تیار کرنے لگا۔ تمام رشتے داروں میں دھوم مچ گئی کہ میں میٹرک کا امتحان دے رہی ہوں۔ میری تیس سال کی عمر گھٹ کر بیس سال ہو گئی۔ امتحانات شروع ہوئے تو میرے شوہر کے محکمے کا سارا عملہ

حرکت میں آ گیا۔ ریزلٹ نکلا میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگئی۔ کچھ روپیہ ضرور خرچ ہوا۔ جب میٹرک پاس ہوگئی تو آئی۔ اے اور بی۔ اے میں کیا رکھا تھا۔ ہر دو سال پر لوگ سنتے رہے کہ میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگئی ہوں۔ کالج کے تقریباً سبھی پروفیسر میرے شوہر کے دوست تھے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن انھیں پارٹیاں دیتی۔ ان کے پروگراموں میں شریک ہوتی اور جب میرے امتحانات ختم ہو جاتے تو جہاں جہاں میرے پرچے جاتے وہاں وہاں میرا بھاری پرس اور کسی سینئر پروفیسر کی زبردست سفارش پہنچ جاتی۔

اس طرح چند برسوں میں ہی نہایت شان سے میں نے ایم۔ اے۔ کر لیا۔ جتنے روپے میں نے اب تک خرچ کیے تھے انھیں وصول کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ مقامی گرلس کالج میں ہر طرف سے میرے لیے سفارشیں پہنچنے لگیں۔ میری قابلیت اور ذہانت کا ہر زبان پر ذکر تھا۔ کیوں نہ ہو میں نے ہر درجہ امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔

کالج میں بطور لکچرار تقرر ہوتے ہی میں نے ایک زوردار پارٹی دی۔ اپنے سارے جاننے والوں کو خطوط اور تاروں کے ذریعے اس ملازمت کی اطلاع بھیج دی ہندوستان ہی نہیں دوسرے ممالک میں رہنے والے رشتے داروں کو بھی بہت جلد معلوم ہوگیا کہ میں اردو ادب کی لکچرار ہوگئی ہوں۔

لکچرار تو بن گئی مگر مجھے یہ پریشانی لاحق ہوگئی کہ اب میں کیا کروں۔ پڑھنا پڑھانا تو میرے بس کا روگ کبھی تھا ہی نہیں کہ اب ہوتا۔ الٰہی تو ہی اس بیڑے کو پار لگا۔ یہ دعا مانگ کر میں نے اپنے استاد محترم کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے مجھے کئی ایسے گر بتائے کہ میرے دماغ کی ساری کھڑکیاں کھٹا کھٹ کھل گئیں یہ کام تو ایم۔ اے پاس کرنے سے بھی زیادہ آسان ہے۔

نئے سیشن کے کلاسز شروع ہوئے تو مجھے بھی رجسٹر سنبھالنا پڑا۔ کئی دن بڑے آرام سے گزرے۔

پہلے دن میں نے سارا وقت روٹین تیار کرنے میں گذارا۔ دوسرے دن لڑکیوں کا تعارف حاصل کیا۔ ہر کلاس میں جاتی اور تعارف کی رسم ادا کر کے مسکراتی ہوئی نکل آتی۔ تیسرے دن اتوار تھا۔ چوتھے دن میں نے باری باری ہر کلاس کو سلیبس لکھنے کو کہہ دیا۔ پانچویں دن......

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ اِدھر اُدھر سے معلوم ہوا کہ لڑکیوں میں کچھ بے چینی اور بے اطمینانی پائی جا رہی ہے اب میں نے اپنے استاد کا سکھایا ہوا داؤں مارا مگر کچھ کارگر ثابت نہ ہوا۔ تب مجھے خیال آیا کہ استاد کے اسٹوڈنٹ لڑکے ہوا کرتے ہیں اور یہ لڑکیاں ہیں انھیں چلانا آسان نہیں۔ میرا سارا اطمینان رخصت ہوگیا۔ کلاس میں پڑھانا ہی ہوگا یہ سوچ کر میں نے باضابطہ کلاس لینے کا عزم کیا۔ نصاب کی کتابیں کھول کر دیکھیں، خاک سمجھ میں نہیں آیا۔ پیریڈ شروع ہونے پر دو لڑکیاں بلانے آئیں بہت سوچ بچار کے بعد میں رجسٹر لے کر تھرڈ ائیر کی کلاس میں پہنچی۔ حاضری لی۔ لڑکیاں بڑی دلچسپی اور اشتیاق بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوئی۔ 'آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ بی۔ اے میں کون کون سی کتابیں پڑھنی ہیں؟'

'جی! معلوم ہے' ایک سُر میں جواب ملا۔

'ٹھیک ہے! تو آج کیا پڑھنا ہے؟'

'جی، ایم۔ آئی۔ ایل۔ پڑھنا ہے' ایک لڑکی نے ذرا جھجھک کر جواب دیا۔

'کون سی کتاب ہے ایم۔ آئی۔ ایل میں' میں نے اس کے جھجکنے سے ذرا نڈر ہو کر پوچھا۔

'گلدستۂ ادب — ' جواب ملا۔

'گلدستۂ ادب؟ یہ کون سی کتاب ہے میں نے تو اس کا نام پہلے کبھی نہیں سنا؟'

'جی یہ اسی سال سے ہمارے نصاب میں شامل کی گئی ہے۔'

'اچھا اچھا تو یہ بات ہے۔ چلیے کتاب نکالیے۔' میں نے جان پر کھیل کر کہا۔

'کتاب تو ابھی ہمارے پاس نہیں ہے۔' لڑکیاں ذرا گھبرائیں۔ ان کو گھبراتے دیکھ کر میں شیر ہوگئی۔

'اچھا تو بغیر کتابوں کے کیا ہمارا منہ دیکھنے کے لیے آپ لوگ تشریف لائی ہیں؟ آئندہ کتابیں لے کر آئیں گی تو پڑھاؤں گی۔ ورنہ نہیں۔' اتنا کہہ کر میں غصے میں کلاس روم سے باہر آ گئی۔ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی کہ چلو آج تو بلا ٹلی۔

دوسرا پیریڈ شروع ہوا۔ فرسٹ ایئر کو پڑھانا تھا۔ کلاس میں پہنچی۔ لڑکیاں تعظیم کے لیے کھڑی ہوگئیں۔ میں نے نہایت شان سے ہاتھ اٹھا کر انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حاضری ہوئی لڑکیاں گڑبڑا گڑبڑا کر جواب دیتی رہیں۔ انھیں مرعوب دیکھ کر میری ڈھارس بندھ گئی۔

'کیا پڑھنا ہے؟' میں نے وقت ٹالنے کے لیے پوچھا۔

'پرنسپل اردو' ایک ساتھ کئی لڑکیاں بول اٹھیں۔

'یہ مجھے معلوم ہے مگر کون کون سی کتابیں پڑھنی ہیں۔' میں نے ذرا

طنز سے پوچھا حالانکہ سلیبس میں نے ہی لکھوایا تھا۔

ایک لڑکی نے کاپی کھول کر دیکھتے ہوئے فرفر کتابوں کے نام گنوا دیے۔

'آج آپ کیا پڑھیں گی۔' میرا دل پھر دھڑکنے لگا۔

'بانگِ درا'

'بانگ درا' میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے 'بانگ درا' تو کبھی دیکھی بھی نہ تھی۔ البتہ اس کی شرح گھر میں تھی پر وہ بھی میں نے پڑھی کب تھی؟

میں نے سوچا پھر پہلے والا نسخہ آزمانا چاہیے یعنی کتاب نہیں لائیں تو پڑھاؤں کیا؟ ابھی کچھ کہنے کے لیے سر اٹھایا ہی تھا کہ دیکھا ٹیبل پر بانگ درا موجود ہے۔ اُف کمبخت! میں دانت پیس کر رہ گئی۔

کتاب کھول کر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ شاعری ہے۔

'کون سی نظم پڑھنی ہے؟'

'ہمالہ —!'

'اچھا تو غور سے سنیے۔' میں نے زبردستی کھانس کر گلا صاف کیا اور باآواز بلند نظم پڑھنے لگی۔

'باجی! پہلے ہمیں بانگ درا کا مطلب سمجھا دیجیے۔' سامنے کی بینچ سے آواز آئی۔ میں نے گھور کر دیکھا ساری لڑکیاں بڑے انہماک سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

'بانگ درا' بانگ درا' میں نے زیرلب دو تین مرتبہ دوہرایا اور اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس کا مطلب کلبلایا۔ 'بانگ کا مطلب ہے مرغے کی مخصوص آواز جو وہ صبح سویرے ہمیں جگانے کے لیے حلق سے نکالتا ہے۔'

لڑکیوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور 'درا' دراصل لفظ 'دڑ' سے بنا ہے مگر یہاں شاعر کی مراد مرغے کے دربے سے ہے جہاں صبح صبح مرغ بانگ دیتا ہے۔ اس طرح بانگ درا کا مطلب ہوا۔ 'دربے سے ابھرنے والی آواز جو صبح کا پیغام سناتی ہے۔'

'ایک جلوہ تھا کلیم کے طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا، چشمِ بینا کے لیے

اس شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے مطلب بالکل صاف ہے اور تم لوگوں کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ — کلیم طور سینا کے لیے ایک جلوہ تھا اور چشم بینا کے لیے تو سراپا تجلی ہے۔'

استاد کا گر استعمال کرتے ہوئے میں نے چند الفاظ ادھر اُدھر کر کے شعر کو نثر میں بدل دیا۔ ظاہر ہے کہ شعر خود میری سمجھ میں نہ آیا تھا۔

لڑکیاں میرا منہ دیکھ رہی تھیں۔

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اس شعر میں شاعر نے ہمالہ پہاڑ کا میک اپ کیا ہے۔ ہمالہ کی چوٹیاں غازہ، پاؤڈر اور لپ اسٹک لگا کر دلہن بنی شرما رہی ہیں اور بے حد حسین لگ رہی ہیں۔'

میں تشریح کرنے میں کھوئی ہوئی تھی میرے دونوں ہاتھ شرمانے اور بل کھانے کی ادا دکھا رہے تھے۔ پلکیں دلہن کی مانند جھکی جا رہی تھیں کہ میرے کانوں میں کھی کھی اور ہی ہی کی آواز آئی۔ چونک کر سامنے دیکھا تو لڑکیاں منہ دبائے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مارے غصے کے میں فوراً کھڑی ہوگئی۔ 'آپ لوگ سخت بدتمیز ہیں اور مجھے کلاس میں ڈسپلین چاہیے۔ میں اس قسم کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا میں آپ لوگوں کی کلاس آئندہ ہرگز نہ لوں گی' لڑکیاں معافی مانگتی رہ گئیں مگر میں پاؤں پٹکتی کلاس سے نکل آئی۔ اس طرح میں نے اپنے وقار کا سوال اٹھا کر فرسٹ ایئر کا کلاس لینے سے صاف انکار کر دیا۔

دوسرے دن کالج پہنچتے ہی گھنٹی ہوگئی۔ سیکنڈ ایئر کی کلاس تھی۔ جیسے ہیں میں کلاس میں پہنچی لڑکیوں نے مسکراہٹ سے استقبال کیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہاں لحاظ کا نام و نشان نہ تھا۔ خدا خیر کرے۔ دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے رجسٹر کھولا۔ حاضری لی۔

'ہاں! کیا پڑھنا ہے۔' میں نے حسب عادت یا مجبوراً پوچھا۔

'منشی پریم چند کی 'نرملا' جواب ملا۔

'لائیے وہی لائیے' میں نے لڑکیوں کی طرف دیکھا کتاب کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ حوصلہ بڑھا کہ چلو یہاں بھی آج ڈانٹ ڈپٹ سے کام چل جائے گا۔

'کتاب تو ہم آج نہیں لائے لیکن آپ پریم چند کے بارے میں کچھ بتا دیجیے۔'

اُف یہ آفت کی پرکالائیں۔ میں تو ان کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر رہی سمجھ گئی تھی کہ یہ کچھ نہ کچھ شرارت ضرور کریں گی۔

'ٹھیک ہے یہی سہی' میں نے قصاب کے آگے گردن ڈال دی۔

ذہن پر زور ڈالنے پر یاد آیا کہ منشی پریم چند کے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے میرے استاد نے زمینداروں کا بھی ذکر کیا تھا۔ بس مجھے ایک سرا مل گیا۔ میں نے لیکچر دینا شروع کیا۔

'منشی پریم چند غلامی کے دور میں پیدا ہوئے۔ وہ معمولی طریقے

سے کچھ لکھ پڑھ لیتے تھے۔ جب وہ بڑے ہوئے تو اپنے بوڑھے منشی باپ کی جگہ زمیندار کے یہاں منشی کے عہدے پر رکھ لیے گئے۔ اسی لیے وہ منشی پریم چند کہلائے۔'

'لیکن منشی پریم چند تو ناول اور افسانہ لکھتے تھے۔' ایک تیز طرار لڑکی نے بیچ ہی میں مداخلت کی۔

میں چڑ گئی۔ 'آپ نے بیچ میں ٹوک کر میری بات کا لنک (Link) توڑ دیا۔ میں کیا کہہ رہی تھی اور کیا کہنا چاہ رہی تھی سب دماغ سے غائب ہوگیا۔ آئندہ بیچ میں نہ ٹوکا کیجیے۔ جو کچھ پوچھنا ہو بعد میں پوچھیے۔ ہاں! تو میں کیا کہہ رہی تھی؟'

'منشی پریم چند زمیندار کے یہاں منشی تھے۔' ایک لڑکی نے سلسلہ ملایا۔

'ٹھیک ہے، ایک مرتبہ منشی جی سے حساب میں کچھ گڑبڑ ہوگئی۔ زمیندار ان پر سخت ناراض ہوا۔ انھیں برا بھلا کہا اور تنخواہ کاٹ لی۔ اس بات سے منشی جی کو بہت رنج پہنچا۔ انھوں نے زمیندار کی ملازمت ترک کر دی اور کسانوں کے ساتھ مل کر زمیندار کے خلاف انقلاب کا نعرہ بلند کرنے لگے۔ چونکہ منشی گیری کرتے کرتے انھیں لکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس لیے جو کچھ ان پر اور کسانوں پر گزرتی تھی اسے قلمبند کر لیتے تھے۔ وہی بعد میں ناولوں اور افسانوں کی شکل میں شائع ہوا۔'

میں نہایت روانی کے ساتھ لیکچر دے رہی تھی کہ ایک لڑکی کھڑی ہو گئی۔

'کیا بات ہے؟' میں نے چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا۔

'اس کو رہنے دیجیے ہماری سمجھ میں آ گیا۔ ذرا ڈاکٹر اقبال کے بارے میں کچھ بتا دیجیے۔'

میں نے غور سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے پہلے سے ہی سازش کر رکھی تھی۔

'آج نہیں۔ اب کل دیکھوں گی۔' میں نے پہلو بچانا چاہا۔

'ابھی گھنٹی لگنے میں بہت وقت ہے۔ سرسری طور پر بتا دیجیے۔' لڑکی میری پول کھلوانے پر تلی ہوئی تھی۔

'کیا جاننا چاہتی ہیں' میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

'یہی کہ ڈاکٹر اقبال کون تھے اور ان کی کیا اہمیت ہے وغیرہ۔'

'ڈاکٹر اقبال ہومیو پیتھک کے ڈاکٹر تھے (میں نے آئی۔ اے۔ کے امتحان میں یہی سب کچھ لکھا تھا اور مجھے ستر فی صد نمبر ملے تھے) لیکن ان کی ڈاکٹری زیادہ نہیں چلتی تھی۔ اسی لیے شاعری کرنے لگے۔ وہ قوم کی حالت پر بہت غمگین رہتے تھے۔ قوم دنوں دن مردہ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کو زندہ کرنے کے لیے شاعری کرتے تھے۔ جس قوم کو بھی تباہ حال دیکھتے تھے اس کو شعر لکھ کر دیتے تھے۔ وہ قوم شعر پڑھ کر زندہ ہو جاتی تھی......'

ابھی اور نہ جانے کتنی دیر تک میں علم کا دریا بہاتی کہ گھنٹی ہوگئی۔ اسٹاف روم کی طرف جاتے ہوئے میں اپنے پیچھے قہقہے سنتی رہی۔

اگلے دن سیکنڈ ایئر کی لڑکیوں نے پھر مجھے گھیرا۔ میں بھی تیار ہو کر آئی تھی۔ نوٹ کی کاپی ساتھ تھی۔ آج میں نے اپنے استاد سے ایک نیا سبق سیکھا تھا۔ نہ سمجھانا نہ پڑھانا سیدھے نوٹ لکھوانا۔ چنانچہ حاضری ختم کرتے ہی استاد کی نوٹ بک سے نقل کیا ہوا نوٹ لکھوانا شروع کر دیا۔

مسجد قرطبہ علامہ اقبال کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے......'

'باجی یہ نظم ہمارے نصاب میں نہیں ہے۔' ایک لڑکی بول اٹھی۔

'کیا کہا؟ آپ کے نصاب میں نہیں ہے؟؟ تو پھر کس کے نصاب میں ہے۔'

'ہمیں نہیں معلوم آپ سلیبس میں دیکھ لیجیے۔'

میں نے نوٹ بک کھول کر آئی۔ اے کا سلیبس دیکھا۔ مسجد قرطبہ کہیں نہ تھی۔ بی۔ اے کا سلیبس دیکھا تو آنرز کے پیپر میں نظر آ گئی۔

'اوہ، کوئی بات نہیں۔ لکھیے لکھیے اگر ابھی آپ کے نصاب میں نہیں ہے تو کیا ہوا۔ بی۔ اے میں تو اسے پڑھنا ہی ہے۔ اس وقت کام آ جائے گا۔' لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تک رہی تھیں۔ اور میں نوٹ لکھوائے جا رہی تھی۔ ایک جگہ تحریر کچھ عجیب سی تھی ہزار کوشش کی مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ اپنے ہی ہاتھوں کی لکھی ہوئی تحریر مجھ سے پڑھی نہ جا رہی تھی۔ بیچارگی سے لڑکیوں کی طرف دیکھا تو انھوں نے میری مشکل آسان کر دی۔

'رہنے دیجیے کل لکھوا دیجیے گا۔'

اس طرح میں نے ایک ڈیڑھ ماہ کلاسز لی ہوں گی۔ اس کے بعد تو گھنٹی پر گھنٹی بجتی ہے۔ کوئی لڑکی مجھے بلانے نہیں آتی میں وقت پر کبھی پہنچتی بھی نہیں اگر پہنچ بھی جاؤں تو لڑکیوں کو میری کلاس کی پروا نہیں ہوتی۔ البتہ پرنسپل کے ڈر سے یا اپنے شعبے کی صدر کے ٹوکنے پر کبھی کبھی کلاس لے لیتی ہوں۔ جس میں موجود لڑکیوں کے گھریلو حالات اور ان کے رشتہ داروں کی خیریت دریافت کرنے کے سوا اپنی دولت کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہوں یا شہر کی اہم اور مشہور شخصیتوں سے اپنی رشتہ داری اور تعلقات کا اظہار کرتی رہتی ہوں یا پھر اپنے شعبے کی دوسری ٹیچروں کی نااہلی کا رونا اور آخر میں یہ دعویٰ کہ 'میرے ہی دم سے تو اس کالج میں تعلیم کا معیار بلند ہے ورنہ یہاں کون ہے جسے پڑھانا آتا ہے۔'

سید واصفہ غنی

جدید خواتین افسانہ نگار

مسائل نسواں کے تناظر میں

ہر تخلیق کار اپنے عہد کے سماجی مسائل سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی تخلیق کا خام مواد بھی سماجی حالات سے اخذ کرتا ہے۔ وہ ایک بہتر سماج کے لیے قارئین کے دل و دماغ میں سماجی شعور پیدا کرتا ہے یا سماجی برائی کے تئیں احتجاج کے جذبات اور ذہنی بیداری کو اجاگر کرتا ہے۔ آزادی کے بعد بدلے ہوئے سیاسی سماجی اور معاشی نظام کا اثر خواتین افسانہ نگاروں پر بھی ہوا جنہوں نے اپنے افسانوں میں خواتین کے مسائل کو جرأت مندی سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہاں چند اردو خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کی روشنی میں مسائل نسواں کو پیش کرنے کی کوشش میں سب سے پہلے عصمت چغتائی کے افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' کا تجزیہ پیش کر رہی ہوں۔

اس افسانے میں عصمت چغتائی نے متوسط مسلم گھرانے کے انتہائی اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔ متوسط گھرانے کی کبریٰ جو شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی مگر اس کا رشتہ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ غریب خاندان کے لوگ دِن رات محنت کر کے کسی طرح پیٹ کی آگ تو بجھا لیتے تھے مگر قلیل آمدنی سے نہ تو قیمتی جہیز کا انتظام ہو سکتا تھا، نہ سماج میں ان کی حیثیت مضبوط ہو سکتی تھی۔

محرومی کی کیفیت مصنفہ کی زبانی:

''یاد نہیں اس شبنمی دوپٹے سے پہلے اور کتنے دوپٹے بنے، ٹکے تیار ہوئے اور لکڑی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کوریں ماند پڑ گئیں، طوئی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی بارات نہ آئی''

مشیت ایزدی کو کیا کہیے کہ ایک دن کبریٰ کے ابا چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور پھر کبھی اٹھ نہ سکے۔ ایک غریب بیوہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر سلائی کڑھائی کر کے زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی اور دولت کی چکا چوندھ میں اندھی ہو چکی دنیا یہاں تک کہ رشتہ داروں کی نظروں میں بھی اپنی دونوں بیٹیوں کے وجود سمیت غائب ہو چکی تھی۔

حالانکہ کبریٰ کی ماں ایک ہنس مکھ، ملنسار اور دوسروں کے کام آنے والی عورت تھی۔ مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ وہ ایک غریب عورت تھی اور یہ غریبی کسی سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ نہ دوست احباب سے، نہ رشتہ داروں سے۔ رشتہ دار اپنا کام نکلوانے کے لیے ان سے رابطہ کرتے، کام نکل جانے کے بعد کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ تمہارا اور تمہاری بیٹیوں کا کیا ہوگا۔ یہ کہانی محض کبریٰ کی ماں کی کہانی نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستانی سماج کے ہر گھر کی کہانی ہے کہ لوگوں کو اپنے غریب رشتہ دار ضرورتیں پوری کرنے کی غرض سے تو نظر آ جاتے ہیں مگر ان کی بے بسی اور مجبوری کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔

عورتوں کے سماجی اور معاشی مسائل پر مبنی ان کا افسانہ ''بیکار'' بھی سماج کا آئینہ ہے۔ جس میں انہوں نے ملازمت کرنے والی خواتین کی زندگی میں درپیش پریشانیوں کو پیش کیا ہے۔

اس کہانی میں باقر میاں نامی کردار بے روزگاری کے مسائل سے برسرِ پیکار ہے۔ باقر میاں کی ملازمت چلے جانے کے سبب افراد خانہ کی کفالت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ان کی بیوی ہاجرہ بیگم نے شروع میں اپنے زیورات بیچ بیچ کر گھر کا خرچ چلانے کی کوشش کی۔ مگر کب تک؟ زیورات ختم ہو گئے، لوگوں نے ادھار دینا بند کر دیا۔ آخر ان کی پڑوسن نے انہیں پاس کے اسکول میں ملازمت کرنے کی رائے دی۔ بحالت مجبوری وہ ان کے مشورے پر غور کرنے لگیں۔ لیکن اس دور میں عورتوں کا بے پردہ باہر نکلنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا، کجا کہ ملازمت کرنا۔ جب انہوں نے باقر میاں سے بات کی، وہ بھڑک گئے۔ ان کی عزتِ نفس پر کاری ضرب پڑی مگر کب تک۔ آخر باقر میاں بھی ڈھیلے پڑ ہی گئے۔ اور طے پایا کہ جب باقر میاں کو نوکری مل جائے گی، ہاجرہ بیگم یہ ملازمت چھوڑ دیں گی۔ مگر ہاجرہ بیگم کے لیے یہ ملازمت کوئی سکون کی وجہ بن کر نہیں، وبالِ جان بن کر حاضر ہوئی تھی۔ لوگ باقر میاں پہ طنزیہ جملے کستے اور باقر میاں کی احساسِ کمتری

ابھر کر سامنے آجاتی۔ جس کا غصہ وہ اپنی بیوی ہاجرہ بیگم پر نکالتے۔ باقر میاں ہاجرہ بیگم پر شک کرنے لگے تھے۔ ہاجرہ بیگم اپنی طرف سے پوری کوشش کرتیں کہ باقر میاں کا دل ان کی طرف سے صاف ہوجائے مگر آئے دِن کسی نہ کسی بات پر ان کے بیچ جھگڑا ہوجاتا۔

جب سے بیوی کو نوکری ملی تھی باقر میاں کا عجیب حال تھا۔ نہ اگلتے بنتی تھی، نہ نگلتے۔ بس چلتا تو بیوی کو ایک پل نوکری نہ کرنے دیتے۔ یار دوست مذاق ہی مذاق میں چٹکیاں بھرتے:

"یار عیش ہیں تمہارے تو، مزے سے جورو کما کے لاتی ہے بیٹھ کے کھاتے ہو۔ یہاں بیگم کا ہماری وہ نخرہ ہے کہ معاذ اللہ نل کے پانی نہیں پیتیں، آئے دِن زیور اور کپڑے کی فرمائش"

ہاجرہ بیگم کے لئے دوہری مصیبت کھڑی ہوگئی ملازمت کرنے سے ان کی پریشانی کم کیا ہوتی، ان کے مسائل میں اضافہ ہوگیا۔ اسکول کی وجہ سے گھر کی ذمہ داری صحیح سے ادا نہیں ہو پا رہی تھی۔ جس کے لئے بھی انہیں گھر میں باتیں سننے کو ملتیں۔ ہاجرہ بیگم کے صبر کا باندھ ٹوٹنے لگتا۔ نتیجتاً وہ بھی باقر میاں کو پلٹ کر جواب دے دیتیں۔ جس سے گھر کا ماحول اور خراب ہونے لگتا۔ ایک دِن نوبت یہاں تک آپہنچی کہ باقر میاں نے ہاجرہ بیگم پر ہاتھ تک اٹھا دیے۔

عصمت چغتائی نے اس کہانی میں دکھایا ہے کہ سماج کبھی کبھی عورتوں کے ساتھ اس قدر ظالمانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے گھر، اپنی زندگی یا اپنے خاندان کے لئے کچھ کرنا چاہے تو اس کی محنت کی قدر نہ کرکے اس کے لئے راستہ مزید تنگ کر دیتا ہے۔ جہاں اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اضطرابی کیفیت مصنفہ کے مطابق:

"وہ سمجھتی تھی اس کی قربانی کو سراہا جائے گا، ساس کے کچو کے کم ہو جائیں گے اور میاں کا پیار تو ملے گا۔ میاں کما کر لاتا ہے تو بیوی اس کے عوض میں اپنا پیار دیتی ہے۔ اگر بیوی کما کر لائے تو کیا یہ میاں کا فرض نہیں کہ وہ کم از کم اسے اپنے پیار سے تو محروم نہ کرے۔ آخر اس کا قصور کیا ہے یہی نا کہ وہ سب کو فاقوں سے بچا رہی ہے۔ بجائے شاباشی دینے کے محلے کی عورتیں اسے حقارت سے دیکھتی ہیں۔ جیسے وہ بازاری عورت ہو۔ اور وہ پاک دامن گرہستنیں۔ کیا وہ بھوکا مر جانے دیتی تو پارسائی بڑھ جاتی؟ محلے کے مردوں کو اس کا احسان مند ہونا چاہئے تھا کہ وہ ان کی جنس کے ایک فرد کا کام انجام دے رہی ہے۔ ایک کمانے والا مرد فرعون، اور کمانے والی بیوی مجرم"

خواتین کے مسائل پر لکھنے والوں میں ایک مقبول و معروف نام جیلانی بانو کا ہے۔ ان کے افسانوں میں "موم کی مریم" کا ہم جائزہ لیں تو ہمیں احساس ہوگا کہ عورت آج بھی کتنی مجبور و بے بس ہے۔ اس افسانے کی ہیروئن قدسیہ اپنے والدین کی دسویں یا گیارہویں اولاد تھی، وہ بھی لڑکی۔ گھر میں ایک بے کار شئے کی حیثیت سے پلنے والی قدسیہ کو اس ماحول اور لوگوں کے رویہ نے حساس بنا دیا تھا۔ لوگوں کی حقارت بھری نظریں اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچاتی تھی۔ لوگوں کے رویہ نے اسے ضدی اور اپنی من مانی کرنے والی بنا دیا تھا۔ چونکہ وہ ایک لڑکی تھی۔ اس لیے کسی نے اس کے نزدیک جا کر یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ایسی کیوں ہے؟ اس کے اس رویہ کے پیچھے وجہ کیا ہے۔ کبھی کسی نے اسے سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ اسے ہے موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔

جب قدسیہ نے امجد کے آنے والے پیغام کو ٹھکرایا تب بھی پورے خاندان میں اس کی بدنامی ہوئی یہاں تک کہ اس کے والد زہر کھانے پر مجبور ہوگئے۔ اور پھر جب اس کے اپنے ہی گھر کے لے پالک ریاض کے ساتھ محبت کی خبر پھیلی تو نہ صرف ریاض کو گھر بدر کیا گیا بلکہ جب اس نے اس بات پر صبر کرلیا تو لوگ موقع کی تلاش میں لگے رہے اور بہانے بہانے سے اسے کرید کر ذہنی اذیت پہنچاتے رہے۔ آخر کار جب وہ بیمار پڑ گئی تو لوگوں نے اسے بھی بڑی معنی خیزی سے دیکھا۔ یکے بعد دیگرے قدسیہ نے کچھ ایسے جرأت مندانہ اقدام کیے جو خاندان میں پہلے کسی لڑکی کے لیے سوچنا بھی ممنوع تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے ایک ضدی بدمزاج اور آوارہ لڑکی کے خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔

جیلانی بانو کا ایک اور افسانہ "پرامس" ضعیف ناتواں ماں کی بے بسی کی داستان سناتا ہے۔ کہانی کی مرکزی کردار "امو" چار بیٹوں کی ماں ہے۔ امو نے جاگیر بیچ کر اپنے بچوں کو ہونہار اور قابل بنایا، مگر یہ ڈاکٹر انجینئر بچے امو کو ہندوستان میں اکیلا چھوڑ کر امریکہ سدھار جاتے ہیں۔ ماں کی کبھی کبھار فون پر خیریت دریافت کر لیتے یا اچھے موسم میں ہندوستان گھومنے پھرنے کے ساتھ ساتھ امو سے بھی چند دِنوں کے لیے ملاقات کر لیتے۔ ان کا چھوٹا بیٹا اتفاق سے نالائق نکل گیا تھا جس کا پڑھنے لکھنے میں بالکل بھی دل نہیں لگتا تھا۔ آخر کار اس نے سیاست سنبھال لی۔

امو جانتی تھیں کہ ان کے پردیسی بیٹے کا کوئی ٹھیک نہیں کہ وہ لوگ ان کی وفات کے بعد ان کو کاندھا دے سکیں گے یا نہیں۔ اس لیے امو نے

ان سے پرامس لیا تھا کہ ان کے چاروں بیٹے ان کی میت کو کاندھا دینے ضرور آئیں گے۔ سبھی بیٹے اپنی زندگی میں مصروف تھے۔ ان کی ہنستی کھیلتی زندگی میں اموکی ذات اوران کی بیماری کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مگر پرامس کیا تھا، اس لیے نبھانے کو مجبور تھے۔ جب اموکی بیماری بڑھتی، ان کے بچے جھنجلا جاتے کہ بار بار ہمیں ڈسٹرب کرتی ہیں۔ انہیں ہوتا کچھ نہیں، مگر فون کھڑکا دیتی ہیں۔

آخر کار جب ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا کہ اموا ب 24/گھنٹے سے زیادہ نہیں جی سکتیں تب ان کے بیٹوں نے سفر کی تیاری شروع کی۔

''خورشید ابھی میں نے ڈاکٹر عارف سے بات کی وہ کہہ رہے

تھے کہ زیادہ سے زیادہ 24/گھنٹے۔

تو پھر میں جاؤں گا۔ دہلی کے ایک سیمینار کا فنکشن ہے۔

''ارے پھر تو ہم ایک ہفتے میں واپس آجائیں گے نا

ڈیڈ...پنکی نے خوش ہو کر کہا''

تین دن گذر گئے۔ اموکی حالت بڑی نازک تھی۔ مگر یہاں کس کے پاس وقت تھا۔ وہ ذرا ٹھنڈی پڑیں۔ ان کی اولاد نے ان کا منھ سفید چادر سے ڈھانپنا چاہا۔ مگر امو نے ہاتھ بڑھا کر چادر ہٹادی۔ ان کی اولاد شرمندہ تو ہوئی کہ

''امو سمجھ گئیں کہ ہم نے ان کی موت کا دکھ کتنی آسانی سے سہہ

لیا''۔

جب ان کے بچے ان کو اکیلا چھوڑ کر چپکے سے نکل لیے۔ اسی رات اموکی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ گویا انہوں نے اپنے بچوں کو یوں چپکے سے بھاگ جاتے ہوئے دیکھ لیا ہو اور وہ یہ صدمہ برداشت نہ کرسکی ہوں۔

یہاں تک کہ ان کا چھوٹا بیٹا پارٹی کے کام میں اتنا مصروف رہا کہ اس نے بھی ماں کے پاس آنے کی زحمت نہ کی۔ بلکہ دہلی کے باہر، بیٹھ کر اسے اس بات کی فکر کھائے جارہی تھی کہ اس کی ماں کے انتقال کی خبر میڈیا میں اچھی طرح سے آنی چاہیے۔ فلاں ہاسپٹل کا نام بھی صاف صاف دکھائی دینا چاہیے۔

مسائل نسواں سے متعلق جیلانی بانو کا ایک افسانہ ''سونا آنگن'' ہے۔ جس میں بہو بیگم جو کہ افسانے کا ایک مرکزی کردار ہے ان کے سات بچے تھے۔ مگر سب کے سب ماں باپ کی نظروں سے دور۔ بیٹے اور بہوئیں کئی کئی سال ماں باپ کی خیر خبر لینے نہیں آتے۔ اس لیے وہ اپنے بھانجے اور بھانجیوں کے ساتھ خوش رہنے کی کوشش کرتیں۔

ایک دِن ان کی بھانجی رضیہ آتی ہے اور رونے لگتی ہے اس نے بتایا کہ شوہر نے دوسری شادی کرلی ہے۔

تبھی بہو بیگم کو احساس ہوتا ہے کہ وہ تو بچوں کے رہتے ہوئے بھی بانجھ جیسی زندگی گذار رہی ہیں۔ وہ رضیہ کو تسلی دینے لگتی ہیں۔

''رضیہ بیٹی، میری گڑیا صبر کر۔ پر میں دل ہی دل میں بولی

مجھے دیکھو میں بانجھ سے بھی بدتر ہوں۔

اس افسانے میں جیلانی بانو نے عورتوں کی مظلومیت کو پیش کیا ہے کہ جب وہ سات بچوں کی ماں ہوتی ہے تو بھی اولاد ماں باپ کو تنہا چھوڑ کر اپنی زندگی میں مگن رہتی ہے۔ اور جب اس کے بچے نہ ہوں تو بھی اکیلے پن کی سزا اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

جدید اردو افسانے میں ترنم ریاض نے بھی اپنے افسانہ ''پانی کا رنگ'' کے ذریعہ عورتوں کے اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے اس افسانے میں دکھایا ہے کہ ہمارے سماج میں عورت محض خوبصورتی اور حسن کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

افسانہ کی ہیروئن خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہے۔ وہ ایک مقبول صحافی اور مشہور قلم کار ہے۔ لوگ اس کے مضامین کے مداح ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ لوگ اس کی ذہانت اور اس کی لیاقت کی وجہ سے اسے اہمیت دیں۔ مگر اسے ہر بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے حسن کے سامنے اس کی قابلیت اور ذہانت پسِ پشت چلی جاتی ہے اور لوگوں کے سامنے اس کی حیثیت ایک حسین عورت سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔

جدید افسانے میں ایک اہم نام مسرور جہاں کا ہے۔ ان کا افسانہ ''چارہ گری'' آج کی خواتین المیہ ہے۔ جس سے تقریباً ہر متوسط طبقہ کی لڑکی کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔

اس کہانی کی ہیروئن انیتا ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہے جو کہ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ مگر اسے بھی اس معاشرے کی روایت کے مطابق خوب سجا سنوار کر سماج کے سامنے اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ کوئی اسے پسند کرلے اور اس کا گھر بس جائے جبکہ انیتا کو اس بات سے چڑ تھی کہ کیا میری تعلیم و تربیت، میری شخصیت کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے؟ جو مجھے ظاہری ساز و سامان سے سجا کر لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ اسے اپنا آپ ہلکا لگنے لگتا ہے۔ اس کے لیے وہ ماں کے سامنے احتجاج بھی کرتی ہے۔

Syed Wasfa Ghani

Deptt. of urdu

S.P. Jain college

Sasaram- 821115 (Bihar)

فنِ خاکہ نگاری

آسیہ طلعت

نثر میں شخصی کوائف کے بیان کے لیے جو اصناف مشہور ہیں ان میں سوانح، خودنوشت یعنی آپ بیتی اور خاکہ نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یوں تو افسانے، ڈرامے اور ناولوں میں بھی مختلف کرداروں کو پیش کیا جاتا ہے لیکن خاکہ نگاری میں شخصیات کو پیش کرنے کا انداز اس صنف کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ شخصیات جیتے جاگتے لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور فرضی کردار بھی۔

خاکہ نگاری نثر کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی شخصیت کے ظاہر و باطن کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ قارئین کے ذہن میں اس کی ایک واضح تصویر ابھر آئے گویا پڑھنے والے نے نہ صرف قلمی چہرہ دیکھا ہے بلکہ خود شخصیت کو دیکھا اور سمجھا ہے۔ ایک عمدہ خاکہ کسی شخص سے ملاقات کے لطف و احساس کا وسیلہ ہے۔ خاکہ نگار تہہ در تہہ شخصیت تک کسی طرح رسائی حاصل کر کے اسے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ خاکہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ شخصیت کے باطنی اور خارجی احوال و کوائف کو نمایاں کرتا ہے۔

دنیا میں ہر قسم کے انسان موجود ہیں، ہر انسان خود ایک وسیع دنیا کے مماثل ہے۔ اس لحاظ سے خاکے کا موضوع عظیم ہستیاں بھی ہو سکتی ہیں اور عام اوسط درجے کے افراد بھی۔ اردو خاکہ نگاروں نے صرف مخصوص یا ایک ہی طرح کے افراد کو موضوع نہیں بنایا بلکہ ان کے خاکوں میں رہنما، علما، مقرر، سیاست داں، شاعر، ادیب ذاتی دوست، سبھی قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ اردو میں ادب کی دنیا سے ہٹ کر زندگی کے اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے عظیم اور شہرت کے حامل افراد کے خاکے نسبتاً کم تعداد میں لکھے گئے ہیں۔

خاکہ نگار کو خاکے کے ذریعے جو مواد حاصل ہو سکتا ہے

خاکہ نگار مختلف ذرائع سے اپنی نگارشات کے لیے مواد حاصل کرتا ہے۔ مثلاً ذاتی معلومات، خطوط، شاعری، دیگر تصانیف وغیرہ۔ شخصی خاکوں میں مواد کی فراہمی کا پہلا اور اہم ذریعہ خود خاکہ نگار کی ذاتی معلومات ہے یعنی وہ باتیں جو خاکہ نگار کسی شخصیت کے بارے میں جانتا ہے۔ یعنی اس کے کردار سے متعلق واقفیت کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ اپنے نجی اور بے تکلف خطوط میں انسان کھل کر سامنے آجاتا ہے گویا مراسلے وہ روشندان ہیں جن کے ذریعے خاکہ نگار کسی شخصیت کے اندر جھانکتا ہے۔ کسی شاعر یا ادیب کا خاکہ لکھتے وقت اس کے کلام یا نگارشات کی مدد سے اس کی شخصیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ قلم کار اپنا مافی الضمیر اپنی تخلیقات میں ظاہر کرتا ہے۔

شاعر کے اُسلوب، لب و لہجہ، اس کے جذبات و خیالات بھی اس کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ خاکے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ صرف خاکہ ہو۔ مختصر خاکہ نگاری کی طرح شخصی خاکہ نگاری کا ایک فنی وصف اس کا اختصار ہے۔ اختصار سے محض لفظوں کی کفایت مراد نہیں بلکہ ایسی کفایتِ الفاظ مراد ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ ایک اچھا خاکہ طوالت و اختصار کا پابند نہیں، البتہ مختصر خاکے بہتر سمجھے جاتے ہیں ان میں واقعات اور تاثرات کو جامع انداز میں پیش کرنا بھی خاکہ نگار کی ہنرمندی پر منحصر ہے۔ یہ مشکل کام ہے، جس میں واقعات اور خیالات کا انتخاب اہمیت کا حامل ہے۔

کردار نگاری خاکے کے جملہ عناصرِ ترکیبی میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ کردار کی نشوونما اور اس کی زندگی کے ارتقائی مراحل کو اختصار سے بیان کر کے اس شخص کی تصویر ابھاری جا سکتی ہے۔ اگر خاکوں میں کردار کا ارتقاء ہو بھی تو وہ ایک ٹائپ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ کردار کی شخصیت کے خدوخال حرکات و سکنات، لباس، نفسیات، کیفیات وغیرہ

سے مرکب ہوتا ہے۔

خاکے کا پلاٹ کردار کے تابع ہوتا ہے۔ خاکے کا مقصد ہی کسی شخصیت کے متعلق تاثر کو ابھارنا ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کی گہرائیوں میں نہ جانے کیا کیا چھپا ہے۔ خاکہ نگار کی قوتِ مشاہدہ تیز ہو اور بیانیہ پر اسے قدرت حاصل ہو تو وہ انسانی شخصیت کو گہرائی تک سمجھنے کا اہل ہوتا ہے اور اس کی شخصیت کے گوہرِ آبدار کو اپنی تحریر میں سجا دیتا ہے۔ خاکہ نگاری کے لئے مردم شناسی اور انسانی نفسیات سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔

خاکہ نگار کو کہانی پن سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ صرف کردار کی شخصیت پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے اور ایسے واقعات کا انتخاب کرتا ہے جس سے اس کردار کی شخصیت کا کوئی گوشہ منور ہو سکے۔ یہ اتفاق ہو سکتا ہے کہ کسی خاکے میں کہانی پن پیدا ہو جائے لیکن کہانی یا افسانہ کسی خاکے میں مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ خاکہ نگار کردار کی تعریف و توصیف کرتا جائے، بعض اوقات وہ کسی شخص کی کمزوریوں کو بھی اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس شخصیت سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کی مثال مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے خاکے ہیں خاص طور پر عمیق حنفی کا خاکہ۔

خاکوں میں منظر کشی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، یہ واقعہ نگاری کا ایک جز ہے۔ منظر اس کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا واقعے کی مختلف جزیات کے مجموعے سے مرتب ہوتا ہے۔ کسی چیز، کسی حالت یا کسی کیفیت کا بیان اس طرح کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ اردو میں شاہد احمد دہلوی کے خاکوں میں اس کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔

ادب کی کوئی صنف زبان و بیان کے سہارے کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی، یہی حال خاکے کا ہے۔ یہ بیانیہ تحریر کا نمونہ ہے اس لحاظ سے اس میں بیان کلیدی اہمیت کا حامل ہے ۔ بیان کی صناعی کے ذریعے ہی خاکہ نگار کسی شخصیت کو اس کے معائب و محاسن کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔ خاکہ نگار کی جادو بیانی ہی کسی شخصیت کو مسحور کن صورت عطا کرتی ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش محمد حسین آزاد کی تحریروں میں ملتے ہیں پھر عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں خاکہ نگاری کے ایسے نمونے ملتے ہیں جنھیں مثالی خاکے کہا جا سکتا ہے۔ شخصی خاکوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا 'نذیر احمد کی کہانی' اردو کے طویل خاکوں میں مشہور ہے۔ اردو کے دیگر خاکہ نگاروں میں مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی، خواجہ غلام السیدین، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، اشرف صبوحی، دیوان سنگھ مفتوں، شوکت تھانوی، مالک رام، اعجاز حسین، چراغ حسن حسرت، غلام احمد فرقت کاکوروی، محمد طفیل، ضیاالدین برنی، نریش کمار شاد وغیرہ مشہور ہیں۔

اردو میں بے شمار خاکوں کے مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان میں کئی خاکے ایسے ہیں جو اردو ادب میں لکھنے والوں کی پہچان بن گئے ہیں ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ، نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، رشید احمد صدیقی (کندن چپراسی) مولوی عبدالحق (نام دیو مالی) عصمت چغتائی (دوزخی) کنہیا لال کپور (پطرس بخاری) مجتبیٰ حسین (عمیق حنفی) کرشن چندر (سعادت حسن منٹو)، خواجہ حسن نظامی (مسٹر آصف علی)، محمد مجیب (رمضان علی)، ان کے علاوہ کئی خاکوں کی کتابیں بھی اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں مثلاً چند ہم عصر (مولوی عبدالحق)، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ، خنداں (رشید احمد صدیقی) گنجینۂ گوہر (شاہد احمد دہلوی) دلّی کی چند اہم ہستیاں

(اشرف صبوحی)، آدمی نامہ (مجتبیٰ حسین)، یادِ رفتگاں (سید سلیمان ندوی) آندھی میں چراغ (غلام السیدین) خواتین خاکہ نگاروں میں عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، ادا جعفری، رفیعہ شبنم عابدی، زاہدہ زیدی وغیرہ کے خاکے ایک مختلف رنگ و آہنگ اور اسلوب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

غرض دیگر شعری و نثری اصناف ہی کی طرح خاکہ نگاری کا اردو میں قابلِ قدر سرمایہ موجود ہے۔

Aasia Talat
Plot No,30., Gulistan Colony
Near Pande Lawns
Nagpur-440013 (M.S)

فرہنگ آصفیہ سے

آنکھوں کے ناخون تولو یا لواؤ ۔ محاورہ (پورب) ذرا آنکھ کا پردہ تو اٹھاؤ۔ غفلت تو دور کرو۔ نرے اندھے نہ بنو۔ آنکھوں کو درست کر کے دیکھو۔ کچھ پرکھ پیدا کرو۔ آنکھیں بنواؤ۔ شناخت سیکھو۔ شناخت پیدا کرو۔ (جب کوئی بر ابر کا یار یا کم رتبہ آدمی کسی اچھی چیز کو برا بتاتا یا کسی عمدہ چیز کی قیمت اسکی حیثیت سے بہت کم لگاتا ہے۔ تو اس حالت میں یہ محاورہ طنزاً کہتے ہیں۔ چونکہ آنکھ میں ناخن کوئی شئے نہیں ہے۔ اس سبب سے شاید یہاں ناخون مجازاً ناختہ ہو جو ایک سفیدی آنکھ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بڑھتے بڑھتے آدمی کو اندھا کر دیتی ہے۔ یا بڑی بڑی پلکیں۔ مگر اول وجہ قوی ہے اور دوسری ضعیف

چمن آرا

غالب کی خوش طبعی

ہنسی ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعے زندگی کی کھردری سطح کو ہموار کیا جاسکتا ہے ہنسی افراد کو باہم مربوط کرتی ہے اور ایک ایسا آلہ بھی ہے جس کے ذریعے سماج میں وہ ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو اس کے ضابطۂ حیات سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہنسی کا دوسرا نام مزاح ہے۔ مزاح انسانی زندگی کی تلخیوں اور الم ناک لمحات کو پرمسرت اور خوشگوار بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اور انسانی ذہن کو جودت عطا کرتا ہے۔ بقول مولانا حالی:

"مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا۔ ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہوجاتے ہیں"

(یادگارِ غالب از مولانا حالی)

طنز، ظرافت کی ایک موثر شکل ہے اسے Satire بھی کہتے ہیں۔ برگسان نے طنز کو "خطیبانہ طعن و تعریض کا نام دیا ہے" بنیادی طور پر طنز ایک باشعور، حساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے۔ اردو میں طنز و مزاح ایک ترکیب بن گئی ہے۔ جسے ظرافت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ طنز و مزاح دونوں ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔ طنز سماج اور انسان کے زخموں کی جانب ہمیں متوجہ کر کے ایک بہت بڑی انسانی خدمت انجام دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف خالص مزاح پھیکا اور بدمزہ زندگیوں کو منور کرتا اور مسرت و خوشی بہم پہنچاتا ہے۔ افادی نقطۂ نظر سے دونوں ہی ہمارے رفیق و غم گسار ہیں۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مزاح انسانی زندگی کی ناہمواریوں اور بے ڈھنگے پن کو بے نقاب کرتا ہے اور طنز نگار زندگی کی عام روش سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے کسی سمت میں بدلنا چاہتا ہے۔ طنز کے لیے مزاح ضروری ہے۔ مگر مزاح طنز کے بغیر بھی مکمل ہے۔ اس تمہید کا مقصد اس امر کی نشان دہی تھی کہ غالب کے یہاں طنز و مزاح کی نوعیت ایک گہری فکری بنیاد بھی رکھتی ہے۔ غالب کے یہاں شاعری اور خطوط دونوں میں طنز و مزاح کے عناصر موجود ہیں۔ ان کی طبیعت میں شوخی تھی۔ ان کے یہاں مزاح کی بے ساختگی، زبان کی لطافت اور بیان کی حلاوت نظر آتی ہے۔ ان کی تحریر اور تقریر میں بھی لطف تھا۔ بقول حالی

وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ مزاج میں ظراف میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوانِ ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے"

(یادگار غالب از مولانا حالی ص:60)

غالب کے کلام میں ہمیں شاعرانہ مزاح کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ شاعرانہ مزاح اس مزاح کو کہتے ہیں جو اگر ابھرے تو تبسم تک آکر رک جائے اور جب بڑھے تو زہرخند ہوجائے۔ یہ مزاح شاعر کے احساسات کی گہرائی اور حقائق پر کڑی گرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسا مزاح نگار ایک نمایاں تبسم سے انسان کی توقعات اور خوابوں کے انجام کا احساس دلا کر اسے آنے والی ناکامیوں کے لیے تیار کرتا ہے۔ مرزا غالب کے یہاں یہ شاعرانہ مزاح عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ انسان کو حقائق سے متعارف کراتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

یہ اشعار خواب پرست انسان کو حقائق کے قریب لانے کی کوشش ہیں۔ ان میں ہلکا پھلکا مزاح ہے۔ جو کہ شاعرانہ خوش طبعی کا مظہر ہے وہ اپنے اندر طنز بھی رکھتے ہیں۔

غالب کے یہاں شاعرانہ مزاح کی کیفیت کے ساتھ ساتھ مزاح کا ایک خوشگوار امتزاج بھی ملتا ہے۔ غالب کی زندگی تنگی و عسرت میں بسر ہوئی۔ دوسرے حساس طبع ہونے کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک واضح کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ مگر اس میں سوقیت نہیں ہے بلکہ فکری خوش مزاجی کی وجہ سے اس یاس انگیزی میں بھی مسرت کی ایک لکیر پیدا ہوگئی ہے۔ غالب کے کلام کی ظریفانہ کیفیت ان کے ذہنی وسعت کی غماز ہے۔ ان کے کلام میں خندۂ دنداں نما کی بجائے ایک ہلکی سی یاس انگیز کیفیت مزاح سے گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً

سوزش باطن کے ہیں منکر ورنہ یاں
دل محیط گریہ ولب آشنائے خندہ ہے

عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

غالب کے ان اشعار میں ایک نہایت شائستہ طنز و مزاح کا عنصر موجود ہے۔ ان کے یہاں لہجے کی شوخی اور بیان کی بلاغت بھی عمدہ ہے۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں طنز و مزاح دونوں موجود ہیں۔ میکدہ چھڑانے والوں پر ایک گہرا طنز ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میکدہ چھڑا دینے سے مے کشی کی عادت نہیں چھوٹ سکتی۔ طنز کا دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ جب میکدہ چھوٹ گیا تو اب کیا ہے کہیں پی لیں گے۔ شاعر اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اب تو پینے کے لیے مسجد و مدرسہ یا کوئی خانقاہ زیادہ مناسب رہے گی۔

چمن چمن گل آئینہ در کنار ہوس
امید محو تماشائے گلستاں تجھ سے

یہ شعر طنزیہ ہے۔ اس میں شاعر طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ تو نے اہل ہوس کی آغوش میں چمن در چمن بھر دیے ہیں لیکن جو لوگ تیرا آسرا لگائے بیٹھے ہیں ابھی تک صرف گلستاں کے تماشے ہی میں محو ہیں ان کے حصے میں سوائے اس کے کچھ نہیں آیا کہ وہ گلستاں کو حسرت سے دیکھتے ہیں۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

یہ شعر بے ارادہ شوخی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں شاعر کہتا ہے کہ بہشت اور کوچہ محبوب میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن کوچۂ محبوب میں بہشت سے زیادہ آبادی ہے۔ کوچۂ محبوب تک رسائی زندگی ہی میں ہوسکتی ہے۔ جب کہ بہشت میں پہنچنے کے لیے مرنا شرط ہے۔ اس لیے زیادہ تر لوگ کوچۂ محبوب میں ہی جمگھٹ کے رہتے ہیں۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

اس شعر میں شوخی اور طنز دونوں موجود ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ خدا کی قدرت بھی عجیب ہے کہ جس کی جس فائدے کے لیے علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وہی علاج یا فائدہ دوسروں کو مہیا کرو۔ یعنی گرفتار کرنے والے کی خدمت گزاری پر مقرر کردیا گیا جس چیز سے گریز تھا اس میں پوری طرح پھنس جانا پڑا اس قدر کے بالکل اسی کے ہوکر رہ گئے۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس شعر میں شوخی اور مزاح کی چاشنی اچھوتی اور عمدہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور در پردہ وہ الزام دیتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں وہ شمار داغ جو تو نے دنیا میں دیتے ہیں اور جو شمار میں اسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں۔

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

یہ شعر طنزیہ ہے کہ جو لوگ ستم زدہ ہیں ان پر دنیا تنگ ہو جاتی ہے اتنی تنگ کہ اس کا آسمان چیونٹی کے انڈے کے برابر معلوم ہوتا ہے یا چیونٹی کا انڈا ابھی آسمان کی طرح ستم گر اور اذیت رساں ہو جاتا ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یہ شعر مزاح کی خوب صورت مثال ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے جرم کے ثبوت کی شہادت ضرورت ہونی چاہیے۔ محض فرشتوں کا لکھا جانا کافی نہیں۔

غالب نے اپنے کلام میں خود اپنا مذاق بھی اڑایا ہے۔ وہ اپنے اوپر ہنستے ہیں اور کبھی کبھی غیر ہو کر اجنبی کی سی نظر ڈالتے ہیں۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

بنا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
و گرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب کے قطعات میں بھی طنز و مزاح کے عناصر نظر آتے ہیں

افطار صوم کی کچھ اگر دست گاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

غالب کی ظرافت اور بذلہ سنجی ان کی صفت نہیں بلکہ ذات ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے آرام و افکار کا تذکرہ، دشمن کی شکایت تندرستی ہو یا بیماری کا ذکر ہو تعزیت ہو یا تہنیت سب کو مزاحیہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں ظرافت اور شگفتگی کا رنگ موجود ہے۔ غالب کی ظرافت اور مزاح میں تازگی ذہانت جودت اور ادبیت ہے۔ استذال اور سوقیت نام کو نہیں ہے۔ ان کے مزاح میں فلسفیانہ بصیرت ملتی ہے۔ غالب کے مزاح پر طنز کا ایک باریک نقاب پڑا ہوا ہے۔ غالب کا مزاح اس قسم کا ہے کہ جیسے پرسکون پانی میں اچانک کنکر ڈالنے سے ایک ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہی پرسکون سنجیدگی طاری ہو جاتی ہے۔

غالب کو قدرت نے ظریف طبیعت عطا کی تھی۔ ان کے خطوط میں بھی طنز و مزاح کا عنصر موجود ہے۔ ان خطوط میں قہقہہ بردوش مزاح نہیں ہے بلکہ تبسم زیرِ لب پیدا کرنے والی حلاوت ہے۔ غالب کے جودتِ خیال اور شیرینیٔ بیان نے ان خطوط میں ادبی ظرائف کا اضافہ کر دیا ہے۔ خطوط نگاری ان کے لیے تفریحی مشغلہ تھی وہ خود بھی لطف اٹھاتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی انبساط کا سامان فراہم کرتے تھے۔ ان کے خطوط کا یہ مزاحیہ اور طربیہ انداز اردو ادب میں دوامی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب اپنی ناکامیوں سے کام لینے کا ہنر رکھتے تھے۔ اور اپنے آنسوؤں کی ہنسی میں چھپانا جانتے تھے اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا بیان بھی وہ مزے لے لے کر کرتے اور اپنی مضحکہ خود اڑاتے تھے وہ بھی اس طرح جیسے اپنے آپ کو اپنے دشمن کی نظر سے دیکھ رہے ہوں۔

"جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وادی ہے عام لا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، لقہ، بھٹیارہ، جولاہہ کنجڑا منہ پر داڑھی سر پر بال، فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا"

(بنام مرزا حاتم علی مہر)

غالب نے تعزیتی خطوط اپنے دوستوں اور شاگردوں کو لکھے ہیں ان میں بھی طبیعت کی شگفتگی برقرار رکھی ہے۔ یہ ایک انتہائی صحت مند، اور مثبت اخلاقی رویہ ہے اور جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ غم آگیں مضامین سے یہ خط بوجھل نہ ہو جائیں۔ جیسے

"یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو۔ مگر صبر کرو یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو، ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیونکر نہ روئے گا"

(بنام یوسف مرزا)

غالب کی ہر بات لطف اور مزاح سے بھرپور ہوتی تھی مگر ان کے یہاں مزاح قصداً آیا ہے بلکہ برجستہ، برمحل ہے۔ ان کے یہاں طنز و مزاح کا ایک صحت مند رویہ ہے وہ زندگی کی پریشانیوں اور مصیبتوں سے افسردہ اور غمگین ہونے کے بجائے اس فلسفیانہ انداز میں مزاح میں ڈبو کر پیش کرتے ہیں۔ حقیقی بیان میں انھوں نے طنز و مزاح کے عنصر کو نہایت عمدگی

سے برتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تھا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے۔عرض کیا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا''

(یادگار غالب ص:60)

''حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے ان کو آم نہیں بھائے تھے ایک دہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیئے۔ گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے کہا بیشک گدھا نہیں کھاتا۔

(ایضاً ص:63)

''رمضان کا مہینہ تھا، ایک سنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے ۔عصر کا وقت تھا۔ مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے تعجب سے کہا ''کیا جناب روزہ نہیں ہے؟ مرزا نے کہا سنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن رہے، روزہ کھول لیتا ہوں۔

(ایضاً ص:69)

''ایک دن سید سردار مرحوم شام کو چلے آئے۔ جب تھوڑی دیر ٹھہر کر جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمع دان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے، تا کہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ انھوں نے کہا قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔ مرزا نے کہا'' میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا، بلکہ اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن لیں۔

(ایضاً ص:65-66)

غالب نے اپنے خطوط میں اپنی آپ بیتی، اور چاروں طرف پھیلی ہوئی......اپنے چھوٹے چھوٹے غموں اور خوشیوں کی روداد کو بڑے ہی عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کے خطوط میں ایک پورا عہد، ایک پورا معاشرہ اور ایک پوری روایت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ غالب نے ان میں طنز و مزاح کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ ان کے خطوط میں پر واقع، تجربے اور کیفیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جیسے جاگتے منظر سامنے آگئے ہیں۔ وہ مکتوب نگار سے زیادہ ایک ہنر مند قصہ گو نظر آتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے خطوط کی وساطت سے اور اپنی روح کے ویرانے کو ایک نئی سطح پر آباد کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے روز مرہ کے ویرانے کو ایک نئی سطح پر آباد کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی روز مرہ زندگی کے تجربوں اور واقعات کو استعاراتی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس طرح وہ شاید اپنی محرومیوں اور نارسائیوں پر ایک پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

''یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر کچھ بن نہیں آئی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو ہی غیر تصور کر لیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ تو غالب کے اور جوتی لگتی'

'(بنام مرزا قربان علی بیگ سالک)

غالب کی گرفت زندگی پر خاص مضبوط تھی ان کی اس حقیقت پسندی میں بے نیازی کی ایک شان نظر آتی ہے۔ غالب نے زندگی کی تلخ حقیقتوں اور سچائیوں کو فراخ دلی کے ساتھ قبول کیا ان کے یہاں زندگی سے محبت ہے۔ نفرت نہیں۔ وہ حالات زمانہ سے پریشان ضرور ہیں مگر ناامید نہیں۔ انھوں نے اپنے حالات کو لفظوں کی کاریگری سے ایسے بیان کیا ہے کہ اس کا تاثر بڑھ جاتا ہے۔

غالب نے ایسے سخت حالات کو بڑے ہی سلیقے سے برتا ہے حالانکہ ان کی زندگی مصائب و آلام میں گزری مگر اس کے باوجود وہ ٹوٹتے بکھرتے نظر نہیں آتے۔ ایسے نامساعد حالت میں بھی انھوں نے مزاح کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا ان کے یہاں ایک شائستہ اور سنجیدہ مزاح نظر آتا ہے۔ غالب کے امتیاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی دوسرے شاعر نے اتنا کم لکھ کر ایسی مقبولیت حاصل نہیں کی جتنی کہ غالب نے یہ تو حقیر غالب شاعرانہ عظمت کا ایک الگ پہلو ہے۔ فی الوقت ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کی شاعری اور نثر گہری اور جلال آمیز فلسفیانہ متانت رکھتے ہوئے بھی مزاح اور طنز کی روشنی سے معمور ہے۔ اس حد تک کہ نہ صرف اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ طنز و مزاح کی شمولیت نے ان کی سنجیدہ فکر میں بھی ایک انوکھی اور غیر معمولی جہت پیدا کر دی ہے۔

Dr. Chaman Ara
Associate Professor Urdu,NCERT
Sri Aurbindo Marg
New Delhi-110016

نشاں زیدی

حمیدہ سلطان کے ناول ’رنگ محل‘ میں معاشرے کی عکاسی

زندگی قدرت کی طرف سے ودیعت کیا ہوا ایک حسین تحفہ ہے۔ اور اس تحفہ کو خوش گوار بنانے میں انسان نے بہت سے رسم ورواج کو رائج کر لیا ہے۔ ان میں کچھ رسم ورواج تو اس طرح زندگی میں رچ بس گئے ہیں جیسے ان کے بغیر زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں پیدائش سے لے کر موت تک مختلف قسم کی رسموں کو انجام دیا جاتا ہے۔ ہمارے تخلیق کاروں نے بھی ان رسم ورواج کو اپنی تخلیقات میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور اگر بات خواتین کی کی جائے تو خواتین کے لکھے ہوئے قصوں میں ان کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان رسموں کی جو اہمیت معاشرے میں ہے، اس کو خواتین نے محسوس کیا اور باریک بینی سے رسوم کی مرقع نگاری کی، جس کی ابتداء خواتین کے پہلے ناول ”اصلاح النساء“ سے ہی ہو گئی تھی۔ رشید النساء کے ناول ”اصلاح النساء“ سے متاثر ہو کر بیشتر خواتین نے اپنی تخلیقات میں رسوم کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی ہے۔ حمیدہ سلطان بھی ایک ایسی ہی تخلیق کار ہیں جنہوں نے دہلی کی رسموں کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور قاری کے سامنے پیش کیا۔

حمیدہ سلطان (1914-2002) اردو ادب میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں انہوں نے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی۔ معاشرے کی عکاسی کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ حمیدہ سلطان نے صرف تین ناول لکھے ”ثروت آرا“، رنگ محل“ اور ”بہار وخزاں“۔ ”ثروت آرا“ 1941 میں شائع ہوا۔ ”رنگ محل“ 1960 میں منظر عام پر آیا اور آخری ناول ”بہار وخزاں“ 1996 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ ’رنگ محل‘ میں انہوں نے معاشرے کی بہترین تصویر کھینچی ہے۔

”رنگ محل“ ایک معاشرتی ناول ہے، جس میں دہلی کے اعلیٰ طبقے کے گھرانے کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ کے زمانے کی دہلی کا معاشرہ اپنی سماجی کیفیات اور روایتی قدر کے ساتھ ”رنگ محل“ میں موجود ہے۔ ناول کا آغاز ایک بہت بڑے اور خوبصورت محل سے ہوتا ہے، اسے ہی رنگ محل کہا گیا ہے۔ اور ناول اسی رنگ محل میں انجام تک پہنچتا ہے۔ ناول میں یہ محل محض پس منظر کے طور پر ہی سامنے نہیں آتا بلکہ مصنفہ نے اس محل کو دہلی کے ایک مخصوص طبقے کی عکاسی کے لیے بطور علامت استعمال کیا ہے، جہاں ہمیں دہلی کے معزز اور شریف گھرانوں میں عورتوں کا کیا درجہ تھا، انھیں کس طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا تھا، مردوں کے بنائے ہوئے اس سماجی نظام میں کن کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، شادی بیاہ، بچے کی ولادت پر کس طرح کی رسمیں ہوتی تھیں، سب کچھ نظر آتا ہے۔ شادی بیاہ، موت، خوشی اور غم تمام رسموں کا احاطہ بڑی خوبی کے ساتھ ناول میں کیا گیا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے تمام عیوب ومحاسن کو اس میں بہت ہی باریکی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار زمانی بیگم ہیں، جو بہت نیک سیرت، دریا دل ہمدرد ہیں۔ ناول کی ابتدا ان کی زندگی سے ہوتی ہے اور ان کی موت پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ زمانی بیگم کے شوہر سکندر کا انتقال ہو چکا ہے، ان کے تین بیٹے ہیں۔ زمانی بیگم ہی رنگ محل کی شان ہیں۔ تینوں بیٹے اور بہوئیں ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ناول کی خوبی یہ ہے کہ حمیدہ سلطان نے زیادہ تر کرداروں سے ابتدا

ہی میں متعارف کرادیا ہے، جس سے ناول کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی ہے ورنہ ناول میں کرداروں کی بھر مار ہے اور کئی کردار ایسے ہیں، جو ایک ہی طرح کی ٹریجڈی سے دوچار ہیں۔محلوں میں رہنے والی خواتین کی زندگی کا باریک بینی سے مطالعہ کرکے ان کی نفسیات کو پیش کیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کرایا ہے کہ عیش وآرام کے سارے سامان مہیا ہونے کے باوجود دلی سکون حاصل نہیں ہے۔ان کے مرد باہر رنگ رلیاں مناتے ہیں، اور یہ محل کے اندر عیش وآرام کی زندگی تو بسر کرتی ہیں، لیکن گھٹ گھٹ کر دم بھی توڑ دیتی ہیں۔

یہ حمیدہ سلطان کا ہی امتیاز ہے کہ انھوں نے بڑے گھر کی عورتوں کی کھوکھلی شان وشوکت اور چونچلوں کو اجاگر کیا ہے۔اس سماجی خرابی کو واضح کرنے کے لیے قیصر کے کردار کو مثال کے طور پیش کیا ہے، جو شوہر کی توجہ کا مرکز کبھی نہ بن سکی اور جب وہ شوہر سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں کرپاتی ہے، تو وہ دوسروں کی زندگی کے سکون کو ختم کرنا چاہتی ہے اور دوسروں کا سکون دیکھ کر کڑھتی رہتی ہے۔اسی طرح ایک کردار انجو کا ہے، جس کی شادی سورج گڑھ کے نواب سے ہوئی ہے، جب اس کے کوئی اولاد نہیں ہوتی تو وہ نواب کی خوشیوں کی خاطر شوہر کی دوسری اور پھر تیسری شادی بھی خود کرادیتی ہے۔ وہ بظاہر محل کی رانی ہے، لیکن اسے دلی سکون حاصل نہیں ہے۔ناول کے زیادہ تر نسائی کردار اسی طرح کے مسائل سے دوچار ہیں۔ اس کے برعکس مرد کردار عیش پرست، خود پسند، ضدی اور بہت ہی آزاد طبیعت کے مالک ہیں، ان کو اپنی عیش پرستی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ان کو اپنی جاگیر پر بہت غرور ہے، ان کا مقصد بیوی کو شریک حیات بنانا نہیں بلکہ وارث حاصل کرنا ہوتا ہے اور جب یہ مقصد ایک بیوی سے پورا نہیں ہوتا، تو وہ چار چار شادیاں کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔اس ذہنیت کے مردوں کی عکاسی کے لیے مصنفہ نے شاہرخ کا کردار پیش کیا ہے، جو بہت خودسر اور مغرور ہے۔جب اس کی منگیتر فریدہ سے شادی نہیں ہوتی، تو وہ دوسری لڑکی سے شادی کرتا ہے، لیکن اس لڑکی میں بھی وہ فریدہ ہی کو ڈھونڈتا ہے۔اسی طرح وہ چار شادیاں کرلیتا ہے اور اپنی خواہش کی خاطر تین معصوم لڑکیوں کو طلاق دے کر ان کی زندگی برباد کرتا ہے۔ناول میں کم عمری کی شادی کے برے نتائج کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں اور اس طرف بھی توجہ مبذول کرائی گئی ہے، جب دولت کی خاطر والدین اپنی کم عمر بیٹیوں کی شادی زیادہ عمر والے مردوں سے، جو پہلے ہی سے شادی شدہ ہوتے ہیں، کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔یہ خیال ناول کی کم عمر لڑکی نبو کے کردار کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔نبو جب گیارہ برس کی تھی تو اس کی پھوپھی کا انتقال ہوجاتا ہے اور اس کی شادی اس کے پھوپھا جو پانچ بچوں کے باپ ہیں سے کردی جاتی ہے اور نبو گیارہ سال کی عمر میں پانچ بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ایک کم عمر بچی جس کی عمر کھیلنے کودنے کی تھی اس پر بوڑھے شوہر اور پانچ بچوں کی ذمہ داری آجاتی ہے، اس کی ذہنی کیفیت کو مصنفہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

> 'بیچاری لڑکی دل مسوس کر رہ جاتی جھمو اور انجو کو چھلانگیں لگاتے گاتے اور ہنستے ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی اور جگمگاتی ریشمی پوشاک
>
> گہنوں پر ایک نفرت بھری نظر ڈالتی، اس کے لبوں پر بے ساختہ ایک آہ آجاتی اور دل اپنی بے بسی پر بھر آتا لیکن کہیں ماں نہ دیکھ لے اس ڈر سے وہ آنکھوں میں آئے آنسو جلدی سے پوچھ ڈالتی۔'

ایک کم عمر لڑکی جو حسرت بھری نگاہوں سے اپنی سہیلیوں کو دیکھ رہی ہے، اس اقتباس میں مصنفہ نے بڑی سلیقہ مندی سے عکاسی کی ہے، ساتھ ہی اس خیال کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بچپن میں سب سے زیادہ کھیل کود پیارا ہوتا ہے۔قیمتی سے قیمتی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔نبو بھی اپنی ہم عمر لڑکیوں کو دیکھ کر اپنی ذمہ داریوں سے بھاگنا چاہتی ہے اور چڑچڑی ہو جاتی ہے۔

ناول کے مطالعہ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حمیدہ سلطان کو بڑے گھر کی عورتوں کی نفسیات پر دسترس حاصل ہے۔انھوں نے ان عورتوں کے ایک ایک پہلو کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور نفسیاتی گرہوں کو کھولنے کی بھرپور کوشش کی ہے وہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں وہ ان گرہوں کو کھولنے کی کوشش میں الجھ گئیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ناول بہت تفصیلی ہوگیا ہے۔"رنگ محل" ناول کے فنی تقاضوں کو کہیں کہیں پورا کرنے سے بھی قاصر رہا ہے اور کہیں بیان بوجھل بھی ہوگیا ہے، لیکن انھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سنا اور جو محسوس کیا اس کو بیان کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں سارے کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ "رنگ محل" کے بارے میں سہیل عظیم آبادی لکھتے ہیں:

> 'خالص فنی لحاظ سے یہ ناول ہمارے فنی تقاضوں کو پورا بھی نہیں کرتا اور نہ ذہنی سطح پر کسی طرف واضح اشارہ ہی کرتا ہے، سارے کا سارا ناول حمیدہ سلطان کی ان یادوں سے مرتب ہے جو انھیں بہت عزیز ہیں۔اس لیے انھوں نے کانٹ چھانٹ بھی نہیں کی، سارے ناول میں ان کی کوشش رہی ہے

کہ ان کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے کانوں نے جو کچھ سنا ہے وہ اس میں محفوظ ہو جائے۔ خفیف سے خفیف جزئیات بھی انھیں عزیز ہیں اور وہ انھیں چھوڑنا نہیں چاہتیں حالانکہ اگر وہ ان جزئیات کو حذف کر دیتی تو ناول کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ اکثر جگہوں پر حسن پیدا ہو جاتا۔'

جہاں تک زبان کا تعلق ہے، حمیدہ سلطان نے صاف ستھری اور رواں زبان کا استعمال کیا ہے۔ جگہ جگہ بیگماتی زبان کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ دراصل حمیدہ سلطان کے نزدیک فنی عوامل اس قدر اہم نہیں تھے، جس قدر اپنے موضوع کی معاشرتی اہمیت، لیکن انھوں نے ناول کو دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی، جس میں کافی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئیں۔ انھوں نے دہلی کی بامحاورہ زبان کو سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ ''رنگ محل'' کی زبان کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> مجھلی بہو صاحب بولیں۔ ''اماں جان کل شام کو امراؤ خانم پھر محمد مرزا کے لڑکے کا پیغام لائی تھیں۔''
>
> سکندر زمانی بیگم نے کہا۔ مہتاب دلہن نبو تمہاری پوتی ہے تم کو اختیار ہے مگر آنکھوں دیکھے مکھی کیسے نگل لی جائے۔ تم کو تو معلوم ہے محمد مرزا کی نانی نواب زادی تھیں مگر خواص کے پیٹ سے تھیں۔ اس لیے ہی کسی برابر والے سے ان کی شادی نہ ہو سکی۔ محمد مرزا کے نانا دلدار مرزا تھے کھرے مغل، مگر اہل شہر میں سے تھے۔ یوں سنا ہے مسعود اچھا لڑکا ہے اور اب تو ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گیا ہے مگر یہ نقص جو ہے۔

اس اقتباس میں مصنفہ نے بڑی روانی اور شستہ زبان میں محلوں میں رہنے والی عورتوں کے خیالات ظاہر کئے ہیں کہ ان حسب و نسب پر کتنا زور رہتا تھا۔ اسی طرح انھوں نے ''بوڑھ سہاگن''، ''دودھوں نہاؤں پوتوں پھلوں'' جیسے الفاظ اور کہاوتوں کا استعمال کر کے دہلی کی بامحاورہ زبان سے روشناس کرایا ہے۔ منظر نگاری میں مہارت دکھائی ہے۔ ''رنگ محل'' میں ان کا مقصد محل کی زندگی سے روشناس کرانا تھا، اس لیے ناول میں طرز حیات کے بیان میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ ناول کے آغاز میں محل اور اس میں رہنے والوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ قاری چار پانچ سطریں پڑھ کر ہی ناول کے پس منظر کا اندازہ لگا سکتا ہے:

> 'ماہ مارچ کی سہانی صبح تھی، سورج نے ابھی مشرق کے دریچے سے جھانکا ہی تھا۔ لیکن رنگ محل میں چہل پہل پورے عروج پر تھی۔ مامائیں اور مغلانیاں چائے ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ انائیں دوا اور مانیاں ہر ایک دلہن اور صاحب زادی کو جگا کر بچوں کے منھ بہلا کر دھلا رہی تھیں۔'

حمیدہ سلطان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ''رنگ محل'' کے ماحول سے چند سطروں میں ہی روشناس کرا دیا ہے۔ اسی طرح محل میں ہونے والی تقریبات کا نقشہ بڑے سلیقہ سے کھینچا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں، یہ ناول بہت زیادہ تفصیلی ہونے کے باوجود دلچسپ ہے۔ اگر مصنفہ فرسودہ قصوں سے گریز کرتیں تو ناول کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ بہرحال دلی کی زندگی کا انھوں نے بڑے سلیقہ سے نقشہ کھینچا ہے۔

Dr.Nisha zaidi
B-63/S-2, D.L.F.Colony
Sahibabad
Distt.Ghaziabad-201005 (UP)

فرہنگ آصفیہ سے

اش اش کرنا - فعل متعدی۔ (۱) نہایت خوش ہونا۔ واہ واہ کرنا۔ خوشی کے مارے وجد کرنا۔ (۲) تحسین و آفرین کرنا۔
(یہ لفظ عربی میں اشاش تھا جس کے معنی شادی و انبساط یعنی خوشی منانے کے آئے ہیں۔ اردو والوں نے اسے بگاڑ کر اش اش کر لیا اور یہاں تک ہاتھ صاف کیا کہ عین سے عش عش لکھنے لگے اور اپنے ذہن میں خلاف قاعدہ عیش اسکا ماخذ بھی قرار دے لیا حالانکہ اس عشعش کے معنی گھونسلے کے آئے ہیں۔ انہیں چاہئے ذرا عربی کی بڑی بڑی فرہنگوں اور مطول کتب لغات کو ملاحظہ فرمائیں۔

آسامی (صحیح) اسامی۔ ع۔ اسم مؤنث۔ جمع الجمع اسم۔ اردو میں بجائے مفرد بغیر مد مستعمل ہے (۱) اسم۔ نام۔ ناؤں۔ (۲) شخص۔ متنفس۔ کس نفر۔ آدمی۔ (فقرے) فی آسامی دو روپیہ۔ وہ سیٹھ اب بھی لاکھوں کی اسامی ہے۔ (۳) وہ شخص جس سے لین دین ہو۔ قرض سودا لینے یا اچاپت رکھنے والا۔ لگا بندھا۔ گاہک یا خریدار (فقرے) لالہ اپنی اسامی کو ابھی سے بھوکا مارنے لگے؟ ہماری اسامی کو نہ بھکاؤ اس باغ کے لئے کوئی اسامی لاؤ۔ (۴) چہرہ۔ حلیہ۔ (۵) خدمت۔ عہدہ۔ کام۔ جگہ۔ نوکری۔ (فقرے) کوئی اسامی خالی نہیں۔ تم کونسی اسامی چاہتے ہو؟۔ (۶) وہ شخص جو کسی ٹھیکیدار یا سرکار کا مالگزار ہو۔ رعیت۔ پرجا۔ اجارہ دار۔ کرایہ دار۔ کسان۔ کاشتکار ہونے جوتنے والا۔ مزارع۔ (۷) مدعا علیہ۔ قرضدار۔ دیندار۔ (۸) گواہ۔ شاہد۔ (فقرہ) فلانی اسامی کو حاضر کرو۔

گذشتہ سے پیوستہ

خواجہ عبدالمنتقم

خواتین کے خلاف خانگی تشدد کے خاتمے کا قانون

(الف) بھارت کے کسی حصے سے کسی شخص کو طلب کرنا اور حاضر کروانا اور حلف پر اس کا بیان لینا،

(ب) کسی دستاویز کے انکشاف اور اسے پیش کرنے کا حکم دینا،

(ج) بیانات حلفی پر شہادت لینا،

(د) کسی عدالت یا دفتر سے کوئی سرکاری ریکارڈ یا اس کی نقل طلب کرنا،

(ہ) گواہوں کے بیان لینے اور دستاویزات کا معائنہ کرنے کے لیے کمیشن جاری کرنا، اور (و) کوئی دیگر امر جو مقرر کیا جائے۔

باب۔4: مالیات، حسابات اور آڈٹ

11- مرکزی حکومت کی گرانٹس۔ (1) مرکزی حکومت اس بارے میں قانون کی رو سے پارلیمنٹ سے کی گئی مناسب تخصیص کے بعد کمیشن کو گرانٹوں کے طور پر زر نقد کی ایسی رقوم ادا کرے گی جنھیں مرکزی حکومت اس ایکٹ کی اغراض کے لیے استعمال میں لانے کی خاطر ٹھیک سمجھے۔

(2) کمیشن ایسی رقوم خرچ کر سکے گا جنھیں وہ اس ایکٹ کے تحت کار ہائے منصبی کی انجام دہی کے لیے ٹھیک سمجھے اور ایسی رقوم ضمن (1) میں محولہ گرانٹوں میں سے واجب الادا اخراجات متصور ہوں گی۔

12- حسابات اور آڈٹ۔ (1) کمیشن مناسب حسابات اور دیگر متعلقہ ریکارڈ رکھے گا اور ایسے فارم کے مطابق حسابات کا سالانہ گوشوارہ مرتب کرے گا جو مرکزی حکومت بھارت کے کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل کے مشورے سے مقرر کرے۔

(2) کمیشن کے حسابات کا آڈٹ کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل ایسے وقفوں سے کرے گا جن کی وہ صراحت کرے اور ایسے آڈٹ کے سلسلے میں کیے گئے کوئی اخراجات کمیشن سے کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل کو واجب الادا ہوں گے۔

(3) کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل اور اس ایکٹ کے تحت کمیشن کے حسابات کے آڈٹ کے متعلق اس کے مقرر کیے گئے کسی شخص کو ایسے آڈٹ کے سلسلے میں وہی حقوق، مراعات اور اختیارات حاصل ہوں گے جو کہ کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل کو سرکاری حسابات کے آڈٹ کے سلسلے میں عام طور پر حاصل ہوتے ہیں اور، خاص طور پر اسے کھاتوں، حسابات، متعلقہ واؤچر اور دیگر دستاویزات اور کاغذات طلب کرنے اور کمیشن کے دفاتر میں سے کسی دفتر کا معائنہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

(4) کمیشن کے حسابات، جو کمپٹرولر جنرل یا اس بارے میں اس کے مقررہ کسی دیگر شخص کے مصدقہ ہوں، ان پر آڈٹ رپورٹ کے ہمراہ، کمیشن سے سالانہ مرکزی حکومت کو بھیجے جائیں گے۔

13- سالانہ رپورٹ: کمیشن ہر مالیاتی سال کے لیے ایسے فارم کے مطابق اور ایسے وقت پر، جو مقرر کیا جائے، اپنی سالانہ رپورٹ مرتب کرے گا، جس میں گزشتہ مالیاتی سال کے دوران اس کی سرگرمیوں کی مکمل تفصیل درج ہوگی اور اس کی ایک نقل مرکزی حکومت کو بھیجے گا۔

14- سالانہ رپورٹ اور آڈٹ رپورٹ پارلیمنٹ کے روبرو پیش کی جائے گی: مرکزی حکومت سالانہ رپورٹ، اس میں درج ایسی سفارشات پر کی گئی کارروائی کی یادداشت، جہاں تک وہ مرکزی حکومت کی نسبت ہو، اور ایسی سفارشات میں سے کسی سفارش کی، اگر کوئی ہو، عدم منظوری کی وجوہات کے ہمراہ اور آڈٹ رپورٹ، کے رپورٹوں کی وصولی کے بعد، جتنی جلد ہو سکے۔ پارلیمنٹ کے ہر ایک ایوان

میں پیش کروائے گی۔

باب-5: متفرق

15- کمیشن کا چیرپرسن، اراکین اور عملہ سرکاری ملازمین ہوں گے: کمیشن کا چیرپرسن، اراکین اور دیگر ملازمین بھارتی مجموعہ تعزیرات کی دفعہ 21 کے معنوں میں سرکاری ملازمین متصور ہوں گے۔

16- مرکزی حکومت کمیشن سے مشورہ کرے گی: مرکزی حکومت حکمت عملی کے ایسے تمام اہم امور پر کمیشن سے مشورہ کرے گی جن سے خواتین متاثر ہوتی ہوں۔

17- قواعد بنانے کا اختیار: (1) مرکزی حکومت، سرکاری گزٹ میں اعلان نامے کے ذریعے اس ایکٹ کی توضیعات کے عمل درآمد کے لیے قواعد بنا سکے گی۔

(2) خاص طور پر اور متذکرہ اختیار کی عمومیت کو مضرت پہنچائے بغیر، ایسے قواعد سے مندرجہ ذیل تمام امور یا ان میں سے کسی امر کی توضیع ہو سکے گی، یعنی:

(الف) دفعہ 54 ضمن (5) کے تحت چیرپرسن اور اراکین اور دفعہ 5 کے ضمن (2) کے تحت افسران اور دیگر ملازمین کو واجب الادا مشاہرے اور الاؤنس اور ان کی دیگر شرائط ملازمت؛

(ب) دفعہ 8 کے ضمن (3) کے تحت شریک کیے گئے اشخاص کی کمیٹی کے اجلاسوں میں حاضری کے لیے الاؤنس؛

(ج) دفعہ 10 کے ضمن (4) کے فقرہ (د) کے تحت دیگر امور؛

(د) ایسا فارم جس کے مطابق دفعہ 12 کے ضمن (1) کے تحت حسابات کا سالانہ گوشوارہ رکھا جائے گا؛

(ہ) ایسا فارم جس کے مطابق؛ اور ایسا وقت جس پر، دفعہ 13 کے تحت سالانہ رپورٹ مرتب کی جائے گی؛

(و) کوئی دیگر امر جو مقرر کیا جانا مطلوب ہو، یا مقرر کیا جائے۔

(3) اس ایکٹ کے تحت بنایا گیا ہر ایک قاعدہ اس کے بنائے جانے کے بعد جتنی جلد ہو سکے، پارلیمنٹ کے ہر ایک ایوان میں جبکہ اس کا اجلاس ہو رہا ہو، تیس 30 دنوں کی ایسی مجموعی مدت کے لیے رکھا جائے گا جو ایک اجلاس یا دو یا زائد یکے بعد دیگرے اجلاسوں پر مشتمل ہو اور اگر فوری بعد والے اجلاس یا متذکرہ بالا یکے بعد دیگرے اجلاسوں کے منقضی ہونے سے پہلے دونوں ایوان قاعدے میں کوئی ترمیم کرنے پر متفق ہو جائیں یا دونوں ایوان متفق ہوں کہ قاعدہ نہیں بنانا چاہیے تو اس کے بعد قاعدہ صرف ایسی ترمیم شدہ صورت میں مؤثر ہوگا یا کوئی اثر نہ رکھے گا، جیسی کہ صورت ہو، تاہم ایسی کوئی ترمیم یا کالعدمی اس قاعدے کے تحت ماقبل کیے گئے کسی امر کے جواز کو مضرت نہیں پہنچائے گی۔

باب -10: خواتین کو جائے ملازمت میں جنسی ایذا دہی سے محفوظ رکھنے کے لیے قانون

Protection of Women Against Sexual Harassment at Workplace Act, 2013

جنسی ایذا دہی یا ناروا جنسی سلوک خواتین کے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ خواتین کو بھی آئین کی دفعہ 21 کے تحت باعزت زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جنسی ایذا دہی سے انھیں آئین کی دفعہ 14 اور 15 کے تحت حاصل حق مساوات کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ میں منظور شدہ CEDAW میں بھی خواتین کے ساتھ ہر طرح کا امتیاز برتنے اور انھیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کرنے کے لیے قانون بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری سپریم کورٹ نے بھی بہت سے معاملات میں بشمول وشاکھا والا معاملہ جنسی امتیاز کو بنیادی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا ہے۔ ان ہی امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری حکومت جائے ملازمت میں جنسی ایذا دہی کے خلاف خواتین کا تحفظ کے عنوان سے موسوم قانون بنایا ہے۔

اس قانون کے مطابق جنسی ایذا دہی میں ناشائستہ جنسی پیش رفت، شہوانی خواہش کا اظہار، جنسی نوعیت کا کوئی دیگر ایسا زبانی یا جسمانی فعل جو جنسی ایذا دہی کے زمرے میں آتا ہے، شامل ہیں۔ اس قانون کے مطابق، 'ایذا دہی' میں کوئی بھی جنسی نوعیت کا گراں خاطر سلوک (خواہ راست ہو یا کنایۃً) شامل ہے جو درج ذیل شکل میں ہو:

(i) جسمانی لمس و پیش رفت یا
(ii) التفات جنسی کی طلب یا درخواست
(iii) جنسی نوعیت کی چھینٹا کشی یا
(iv) فحش تحریر یا تصویر دکھانا یا
(v) جنسی نوعیت کا کوئی بھی دیگر گراں خاطر جسمانی، زبانی یا خاموش طرز عمل

اس قانون میں مندرجہ ذیل حرکات کو بھی جنسی ایذا دہی سمجھا گیا ہے:

1- خواتین کو نوکری دلانے کے معاملے میں ترجیحی رویہ کا وعدہ کرکے ان کے ساتھ اس طرح کی زیادتی

2- دوران ملازمت ان کے لیے مشکلات پیدا کرنا

3- موجودہ یا آئندہ ملازمت کے سلسلہ میں کسی طرح کی دھمکی دینا

4- کام میں دخل اندازی اور خوف پیدا کرنا

اس قانون کا اطلاق نہ صرف سرکاری شعبوں، تنظیموں، اداروں، محکموں، دفتروں پر ہوگا بلکہ گھروں، یونیورسٹیوں، اسپتالوں، این جی اوز، کارخانوں اور دوسرے باضابطہ یا دیگر طور پر قائم کیے گئے اداروں (Formal and Non-formal work places) پر بھی ہوگا۔ اس قانون کی رو سے گھر میں کام کرنے والی خادماؤں اور کھیت میں کام کرنے والی مزدور خواتین کو بھی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ اس قانون میں شامل دفعات کے مطابق، شکایت کنندگان کی شکایات کے ازالے کے لیے اس قانون میں درج تمام اداروں میں اندرونی شکایات کمیٹیاں قائم کرنے کی بات کہی گئی ہے تاکہ ایسی خواتین جو ایذا دہی کا شکار ہوں ان کمیٹیوں میں اپنی شکایات درج کرا سکیں۔ ان کمیٹیوں کو عدالت کا درجہ حاصل ہوگا۔ شکایت ملنے کے بعد اس شکایت کی باقاعدہ انکوائری کرائی جائے گی اور انکوائری کے بعد انکوائری رپورٹ تیار کی جائے گی۔ آجروں کو ایسی تمام شکایات کی بابت 90 دن کے اندر اندر فیصلہ لینا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کر پاتے ہیں تو ان پر 50 ہزار روپے کا جرمانہ عائد کیا جائے گا اور اگر وہ بار بار ایسا کرتے ہیں تو انھیں اس سے بھی زیادہ جرمانہ ادا کرنا پڑے گا اور یہاں تک کہ ایسے اداروں کا جنھیں کسی کاروبار کے لیے لائسنس ملا ہوا ہے یا ان کا رجسٹریشن ہے، حسب صورت، لائسنس یا رجسٹریشن یا دونوں منسوخ کردیے جائیں گے۔ اگر کوئی شخص جھوٹی شکایت کرتا ہے یا جھوٹی شہادت پیش کرتا ہے تو اس کے خلاف بھی کارروائی کی جائے گی۔ علاوہ ازیں متاثر خاتون کو معاوضہ دینے کا بھی التزام ہے ساتھ ہی اس بات کی بھی ممانعت کی گئی ہے کہ شکایت اور جانچ کی کارروائی کی تشہیر نہیں کی جائے گی۔

(''خواتین سے متعلق جنسی ودیگر جرائم''، قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ بتاریخ........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com,sales@ncpul.in, 011-26108159:فیکس 011-26109746:فون

دستخط

ممتاز شیریں

کفارہ

ایک کاغذ بالکل سادہ اور سپید میرے آگے بڑھایا گیا۔ میری کور ہوتی ہوئی آنکھیں جو تاریک خلا میں بھٹک بھٹک کر تھک رہی تھیں۔ اس مکمل سپیدی پر جم کر رہ گئیں۔

اچانک میری نظر کے آگے اس سپیدی پر کالا رنگ انڈیل دیا گیا، گہرا قطرہ۔ قطرہ گرتا اور پھیلتا ہوا۔ پھر یہ کالا رنگ خشک ہو کر سفید کاغذ پر ایک چوڑی پٹی کی شکل میں محیط ہو گیا۔

مشیت کے ہاتھوں نے لکھا اور لفظوں کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ جبر و قہر کی آواز آئی۔

'اس پر دستخط کر دو!'

سیاہی کی گنجان چوڑی پٹی کے نیچے میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دستخط کر دیے۔

میں نے اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیے۔

موت دریچے سے لگی ہوئی۔ مجھ سے ذرا سا دور کھڑی تھی اور مجھے اپنے عشوہ و انداز سے للچا رہی تھی وہ ہیجان خیز اور شہوت انگیز تھی۔ بھری بھری گداری ہوئی رانیں، کولہوں کی گولائیاں جلد سے چپکے ہوئے اسکرٹ سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ریوے لان یا ہیلنا روبنٹائن کا میک اپ چڑھا ہوا تھا۔ دہکتے ہوئے سرخ ہوسناک ہونٹوں پر حقارت اور سفاکی کا تبسم لیے وہ کہہ رہی تھی یہ زندہ نہیں رہے گی۔

'نہیں نہیں ڈاکٹر سپانا کورن ایسا مت کہو۔ سفید براق فرشتۂ رحمت نے چیخ کر کہا۔ اس نے تیزی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ میں اس کی چیخ نہ سننے پاؤں۔ وہ سرگوشی میں ملتجیانہ انداز سے کہے جا رہی تھی نہیں ڈاکٹر اسے بچا لو، ہم سب کو اس سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ کیسی پیاری موہنی سی ہے— اس نے تکلیف سہنے میں کیسی خاموش طاقت اور قوت برداشت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تین دن یہ درد کی اذیت میں مبتلا رہی اور مسکراتی رہی۔ ایک چیخ، ایک کراہنے کی آواز تک اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلتی'۔

گہرے پنسل سے کھنچی ہوئی مصنوعی ابروؤں کی کمانیں تن گئیں درشت آواز نے کہا 'تم لڑکیاں کتنی جذباتی بن سکتی ہو۔ علاج میں جانبداری یا تعلق سے کام نہیں لیا جاتا ہے، سمجھیں! ضابطہ کی پابندی میں جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ امراض کا علاج ایک سائنس ہے۔ تمھیں ہر مرض پر مکمل بے تعلقی سے خالی از جذبات ہو کر توجہ دینی چاہیے۔ اس مریضہ میں یا کسی اور مریضہ میں تمھارے لیے کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس مریضہ کا معاملہ زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہے۔ زندگی کی امید بہت کم ہے' کوئی جاتے جاتے یہ الفاظ سن کر رک گیا۔ جیسے اسے سخت تکلیف ہوئی اور مڑ کر تلخ لہجے میں پوچھا 'کیا انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے؟ یہ مریض تمھارے لیے صرف ایک 'کیس' ہے؟ خدا کا شکر ہے! ڈاکٹر سپانا کوان گو یہ کیس تمھارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسپنگر اس مریض کو بچانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے اور ہر قیمت پر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کریں گے میرے لیے یہ زندگی بہت قیمتی ہے۔' 'بہت عزیز'

اور وہ جو موت تھی، اس نے بے پروائی سے اپنے کندھے سے سکوڑ کی بات سنی ان سنی کر دی۔ 'زیادہ سے زیادہ دس فیصد امکان ہے اس کے زندہ بچنے کا' اس نے حرف آخر کے طور پر اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ گلیٹمنسٹر اکے ہاتھ تھے۔ جن کے ناخنوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

جواب کی سفاکی سے مجروح ہو کر پیار میری طرف اس طرح بڑھا جیسے وہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر موت کے آگے سپر بن جائے گا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور موت کا انتظار کرتی رہی۔ میری زندگی سبکدوش ہوکر گرد بادمرگ کا انتظار کرتی رہی۔

چنانچہ مجھے مرنا تھا۔ ایک بے معنی اور بے مصرف زندگی نا گہاں اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔ میں نے زندگی میں کوئی معرکہ سر نہیں کیا۔ کسی چیز کی تخلیق نہیں کی۔ کوئی ایسا کام نہیں کیا جو میری اب تک کی زندگی کا کوئی جواز بن سکتا لیکن اب تک ایک نئی زندگی کی تخلیق شائد میری زندگی کا جواز بن جائے۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور محبت کے چہرے پر نگاہ کی۔ اس لمحہ مجھ پر منکشف ہوا کہ مجھے کتنا چاہا گیا ہے۔ میری کتنی قدر کی گئی ہے میری زندگی بیکار اور بے مصرف ہونے کے باوجود ان کے لیے اہم اور قیمتی تھی جو مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اس لمحہ جب موت کا سرد ہاتھ مجھ پر منڈلا رہا تھا۔ یہ خیال بڑا اطمینان دہ تھا۔

محبت کا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس چہرے پر اندرونی کرب اضطراب اور پریشانی کے نشانات مرتسم تھے درد کو چھپانے کی کوشش میں ایک ایک نس پر ناقابل برداشت بار پڑ رہا تھا اور محبت کے چہرے کو دیکھتے وقت موت کا عرفان میرے بہت قریب تھا۔

کیا موت گناہ کی قیمت اور کرب جرم کا کفارہ تھا؟ میں تو گناہ سے نا آشنا تھی، یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے کبھی گناہ کی جھلک دیکھ لی ہو، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو؟ اور پھر گناہ کو چھوٹا بڑا قرار دینے کا پیمانہ کس کے پاس ہے؟

محبت کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کا عرفان میرے بہت قریب تھا۔

محبت نے موت سے بچانے کے لیے اپنا بازو بڑھا رکھا تھا اندر گڑی ہوئی نشتر کی سوئی لال لال قطرے چوس رہی تھی۔ سیال سرخی بتدریج بڑھ رہی تھی اور جب سرنج بھر گئی تو سوئی نکال لی گئی۔

سوئی میرے ہاتھ کی باریک رگ کو ٹٹولتی رہی۔ بے شمار مرتبہ سوئی میری کلائی میں داخل ہوئی اور کہنی کے نیچے نیلی رگوں کے پھیلے ہوئے جال میں سرگرداں رہی۔ میرے پلنگ کے پاس لگے ہوئے دہشت ناک سلنڈروں سے گلوکوس کا محلول سوئی کے ذریعے میرے جسم میں داخل ہوتا رہا۔

پھر کسی خطرناک دوا کا محلول قطرہ بہ قطرہ آہستہ آہستہ میری رگ میں اترتا رہا۔

اور جب میں تھکن سے خستہ ہو کر، آنکھیں بند کیے ہوئے، لیٹی ہوئی تھی تو میں نے ایک خوفزدہ کرنے والی آواز کو سرزنش کرتے ہوئے سنا 'یہ بہت خطرناک اور بہت طاقتور عرق ہے اسے بدن میں بہت آہستہ جانا چاہیے۔ اگر بہاؤ تیز ہوگیا یا زیادہ مقدار بدن میں چلی گئی تو شدید انقباض پیدا ہوجانے اور اندرونی حصے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کا خطرہ ہے۔ ذرا سی لاپروائی مہلک ثابت ہوسکتی ہے ساری رات مستقل نگہداشت کی ضرورت ہے۔

ساری رات نگہداشت کی جاتی رہی اور لمحہ بہ لمحہ میری تکلیف اور درد کا اندراج ہوتا رہا، وہ دوسری رات تھی۔ خوفناک اور ڈراؤنی اور یہ تیسری رات۔

اب میری رگوں میں گرم انسانی خون ٹپک رہا تھا۔ بلڈ بینک کے یخ خانوں سے لیا ہوا خون نہیں بلکہ محبت کے بازو سے نکلا ہوا تازہ اور زندہ خون۔ جیسے جیسے یہ خون میرے جسم میں داخل ہو رہا تھا میرا بدن اپنی کھوئی ہوئی حرارت دوبارہ حاصل کر رہا تھا اور مجھ میں زندگی واپس آرہی تھی۔ زندگی میرے پاس مسکراتی ہوئی۔ محبت کی مضطرب اور بے چین نظروں کو ڈھارس بندھاتی ہوئی کھڑی تھی۔

ایک ممنون طمانیت کے ساتھ دو نرم، محبت بھرے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو تھپتھپایا۔ ایک ہاتھ نے بڑھ کر شفقت کے ساتھ میرے ماتھے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔'

'تم ٹھیک ہو جاؤ گی' زندگی کے فرشتے کے ہونٹوں سے ایک مہربان مسکراہٹ کی شعاعیں پھوٹیں۔ 'تم طاقت ور ہو تم میں بحرانی کیفیتوں کے شدائد برداشت کرنے کی طاقت ہے خطرے کو بڑھانے والی چیزیں تو خوف اور لاعلمی ہوتی ہیں اس پورے وقفے میں تم نے بڑی بہادری سے کام لیا ہے اور ہم سے پورا پورا تعاون کیا ہے تمہیں صورت حال کا صحیح شعور ہے اور اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے جو ارادے کی قوت چاہیے وہ بھی تم میں موجود ہے اور تم یقیناً اس پر قابو پا جاؤ گی۔

میں نے پرسکون اور راضی بہ رضا مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور کہا 'ہاں، ڈاکٹر اسپنگلر' اور پھر میں نے محبت کے چہرے کو کھلے ہوئے وسیع دروازوں میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا جو اس کے پیچھے بند ہوگئے۔ یہ آرفیوس کا چہرہ تھا۔ جو روشنی کی دنیا میں غائب ہوگیا۔ ایک ان دیکھی جبری طاقت مجھے تاریکی کی ابدیت میں کھینچ لے گئی پھر بھی یہ موت نہیں تھی جو میرے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ یہ زندگی کا فرشتہ تھا۔ اس کے سفید دانت ایک دلآویز اور مسحور کن مسکراہٹ میں ایک ثانیہ کے لیے چمکے اور پھر ایک سفید نقاب میں روپوش ہوگئے۔ سنہرے بالوں والا سر ایک سفید ٹوپ

میں چھپ گیا اور نیلی آنکھیں جو شفقت سے جگمگاتی تھیں اب سنجیدہ اور متفکر ہوگئی تھیں۔

سفید لبادے اور سفید ٹوپ میں ڈھکے ہوئے اور کئی ایک خاموش سایوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

میں نے اپنی زندگی خدا کے ہاتھوں میں دے دی۔

ریڑھ کی ہڈی کے دہانے پر اعصابی مرکز میں اترتی ہوئی سوئی کے ساتھ موت مجھ میں داخل ہوئی اور یکے بعد دیگرے میرے سارے عضلات، میرا پورا بدن بے حس، سرد اور بے جان ہوتا گیا۔

میں نے ساکت اور بے جان پیکر کو میز پر سفید چادروں میں لپٹا ہوا چھوڑ دیا۔

میں نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ یکدم آزاد اور بے قید، جیسے میں اپنے جسم کے زنداں سے رہا ہو کر ایک بے حد و بے کراں وسعت میں داخل ہوگئی تھی۔

میرے چاروں طرف وسیع زمین پھیلی ہوئی تھی بنجر اور ویران زمین دفعتاً میرے پیروں کے نیچے زمین کانپنے لگی۔ زمین کانپتی لرزتی رہی اور اس طرح تشنج میں مبتلا رہی جیسے دردِ زہ سے گزر رہی ہو زمین نے اپنے اندر سے بیش بہا خزانے کا دفینہ باہر اگل دیا لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔

زمین کو ایک صاف لمبے شگاف میں چاک کیا گیا۔ زمین کا بطن ایک کھلا ہوا خوں ریز کچا زخم تھا۔ جس سے لہو ڈھل ڈھل کر نکل رہا تھا اور جذب ہو رہا تھا۔

'اسکرین ٹیڑھی ہوگئی ہے۔' ایک دبی ہوئی سرگوشی نے جلدی سے کہا۔

'اسکرین ٹھیک کرو۔ ریڑھ کی ہڈی میں دیا ہوا بے ہوشی کا انجکشن ذہن کو مکمل طور پر ماؤف نہیں کر دیتا چند ایک حصے جزوی طور پر زندہ اور ہوشیار رہتے ہیں۔'

زمین سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔ زمین کا بطن مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا اس پر تمام زندگی کا راستہ بند کر دیا گیا۔

ساری زمین اجاڑ اور بنجر تھی ایک ویران خرابہ میرے چاروں طرف تنہائی اور سنسان ویرانی تھی۔ میں اس ویران خرابے کی وسعتوں میں بچھڑی ہوئی بے مقصد گھومتی رہی۔

اچانک نہ جانے کہاں سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ ابھر آیا۔ ان کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی برف پوش چوٹیاں نیلے آسمان کے پس منظر میں سمندر کی منجمد لہریں معلوم ہو رہی تھیں پہاڑوں کی چوٹیاں سارے عناصر کے مقابلے میں امیدوں کی طرف سر بلند کھڑی ہوئی تھیں ان کے درمیان خوف کی تاریک اور گہری کھائیاں تھیں۔ میں امید و بیم کے درمیان ایک گہری کھائی کے کنارے مشیت کی دیوار کو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی اور پہاڑ مل کر ایک ناقابل اندازہ اونچی اور ناقابل گزار دیوار میں تبدیل ہوگئے تھے کیا۔ یہ دیوار موت اور زندگی کے درمیان خط فاصل قائم کرنے والی دیوار تھی۔؟

ناقابل یقین طور پر، معجزانہ طور پر میں نے یہ دیوار اور اپنے آپ کو دیوار کی دوسری طرف پایا اور یہاں پھیلی ہوئی کھلی زمین کی بجائے بھول بھلیوں کی طرح کے راستے تھے میں ان راستوں میں گم ہوگئی۔ بھول بھلیاں پیچ در پیچ کھلتی گئیں اور غلام گردشوں، صحن خانوں اور اونچے اونچے ستونوں میں پھیل گئیں۔

اب میں اپنی پہچان سکتی تھی وہ طویل کھڑا جس کے سرے پر کئی سروں والے ناگ اپنے حسین پھن اٹھائے گویا جھوم رہے تھے یہ سنگ بست راستے یہ صحن خانے یہ اونچے ستون 'انیکلور' کے تھے۔

میں اپسراؤں کی قطاروں کے درمیان چلتی گئی ان اپسراؤں کے سنوارے ہوئے لمبے لمبے بال مرصع کندنی زیور اور نازک حسین بدن اپنے ہوش ربا خموں کے ساتھ رقص کے انداز میں جھکے ہوئے دیواروں پر ابدی نقوش میں مرتسم تھے۔

اس کے جمال کے کھلتے ہوئے گلاب کی کشش سے کھینچ کر۔

اس کے آموں سے لدے ہوئے درخت کی طرح حسین جسم کے پھلوں کی طرف جس کسی نے نظر اٹھائی پھر اس کی نظر سے پلٹ کر واپس نہ آئی۔

باغ میں بہتے ہوئے چشمے کے سکون کی طرح پونم کی چاندرات کی طرح۔

وہ سرمستی و رعنائی کا پیکر بن کر جاگ اٹھی ہے۔

ایک گوشے سے ہر اپسرا زندہ ہو کر نیچے اتر آئی اور سب مل کر رقص میں شامل ہوگئیں۔

آسمانی جل پریاں ناچتے ناچتے ایک بے حدود و بے کراں فضا میں پہنچ گئیں۔

ان کے ملکوتی جسموں کی تابناکی میں روحانی عظمت کے چراغ روشن تھے۔

یہ آسمانی اپسرائیں صرف درباری ناچنے والیاں تھیں ناچ فنکاروں اور مخصوص کھمیر وضع کا تھا۔ ساری اپسرائیں اسی طرح ناچ رہی تھیں جس طرح صدیوں پہلے سوریہ ورمن کے دربار میں انھوں نے ناچا ہوگا۔ نازک ہاتھ مختلف زاویے بتاتی ہوئی مخروطی انگلیاں، بل کھاتے ہوئے اعضا کا لوچ نرم و نازک ہتھیلیاں جو جڑ کر کھلتے ہوئے کنول بن رہی تھیں۔

جو اپسرا ناچتی ہوئی گزرتی اس کی طرح جان لیوا ہیرے کی اگلی اٹھتی جو شیوا نے بدصورت ناقص الخلقت بونے کو بخش دی تھی اور تمام اپسرائیں ایک ایک کرکے مردہ ہوکر گرتی گئیں۔

ننھی دبلی پتلی اور نازک جل پریاں برف کی طرف حسین پروقار، سرد قد اور راج ہنسوں جیسی (Ballerinas) میں بدل گئیں جو جھیل کے سحر سے آزاد ہوکر چاندنی رات میں چائے کووسکی کی مسحور کن موسیقی پر ناچ رہی تھیں۔

راج ہنسوں کی شہزادی سب سے الگ ہوکر اکیلی اپنا آخری رقص کرتی رہی۔ فضا میں اس کی آواز بھی وہ اپنی موت کا نغمہ گا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی حرکات مضمحل ہوتی گئیں اور وہ فرش پر گر پڑی اس کے نازک بدن میں ایک آخری تھرتھراہٹ پیدا ہوئی اور اسی حسن و تمکنت کے ساتھ وہ موت کی آغوش میں سوگئی۔

موت میں بھی ایک وقار اور حسن ہوتا ہے۔

نہیں، نہیں موت تو بدصورت اور مضحک تھی۔ میں نے اصلی اور حکایاتی جنگوں کے مناظر سے منقوش دیواروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے سوچا۔ خوں ریزی کے مناظر، موت اور تباہی کے مناظر اور یہ جہنم تھا، اوی سی، کبھی نہ بجھنے والی آگ سے بھرا الاؤ جو انسانی جسموں کے ایندھن پر جل رہا تھا۔ شعلوں کی تیز زبانیں گناہ گاروں کے تعاقب میں لپک رہی تھیں۔

نٹ راجہ دیوانہ وار اپنا وحشیانہ موت کا ناچ ناچتا رہا اور پھر اپنی ایک ٹانگ رقص کے انداز میں فضا میں معلق کیے ہوئے دوسری ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اس کا پیر انسان کی گردن پر تھا اور انسانی زندگی اس کے پیر کے نیچے دم توڑ رہی تھی۔

ہندوستانی نٹ راجا، شیوا کے زیادہ شفیق کمبوڈین پیکر میں ڈھل گیا اس کے موٹے ہونٹوں پر ایک مہربان بلکہ ہوسناک تبسم تھا اس کے سر پر بالوں کی جٹائیں بل کھاتے ہوئے سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں جن پر نصف چاند کا ہار سجا ہوا تھا۔ شیوا تخریب کا دیوتا تھا اور اسی لیے تخلیق کا بھی دیوتا تھا۔ کیونکہ موت، ہی کی کوکھ سے زندگی نکلتی ہے۔

اور شیو نے اپنے ساتھ سینکڑوں دیوتاؤں اور راکششوں کو لے کر دودھ کے ساگروں کو آب حیات کے لیے منہ ڈالا۔

گلدانی تصویروں کی گیلری سے گزرتی ہوئی میں اوپر چڑھنے لگی مرکزی برج کی عبادت گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اینگ کور کا مندر درجہ بہ درجہ بلند ہوتے ہوئے اتنا حسین اور متناسب لگتا تھا جیسے پتھر میں موسیقی منجمد ہوگئی ہو۔ چار گوشوں کے چار برجوں کی منزلیں مصری اہرام کے سے تکون بناتے مرکزی برج کے کنول کی طرف اٹھتی تھیں اور یہ کنول نما سر بفلک مینار کیلاش یا میرو کے پہاڑ کا اسم تھا کیلاش، جو دیویوں، دیوتاؤں کا مسکن اور ساری کائنات کا مرکز تھا۔

لیکن اور راستہ تنگ اور تاریک تھا، سیڑھیاں اونچی اور چکنی تھیں اندرونی عبادت گاہ میں اندھیرا تھا اور قدم بڑھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

میں آخری زینے پر کھڑی ہوئی تھی، عبادت گاہ سے ایک شبیہ اگربتیاں تھامے ہوئے جو طاق میں جلائی جاتی ہیں۔ نیچے اتر رہی تھی۔ زعفرانی رنگ کی عبا میں ملبوس جو رومی چوغے کی طرح ڈھیلی ڈھالی تھی اس نے سندر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک اور شہ نشین پر بدھ کے مجسموں کی قطار بنی ہوئی تھی۔ یہ منظر بنکلوک کے مشہور سنگ مرمر کے مندر کے جانے پہچانے منظر میں تبدیل ہوگیا۔ بدھ کے سنہری مجسموں کی قطاریں بیٹھے ہوئے مراقبہ میں مستغرق لیٹے ہوئے استاد، ہاتھ اٹھا کر سمندروں کو پرسکون کرتے ہوئے۔

دنیاؤں کی لاعلمی سے، بہت اوپر،
موسموں کے تغیر و تبدل کے سالوں سے، بہت آگے۔
بدھ کا آئین چمک رہا ہے اس طرح جیسے
چاند موسم خزاں کے آسمان پر چمک کر
کائنات کو اپنی محبت کی کرنوں سے پوتر بنا کر آغوش میں لے لیتا ہے۔

جسم ایک بدرو ہے، ہر طرح کی غلاظت اور گندگی کا گھر۔
جاننے والے کے لیے زندگی
ایک ننھے سے دیے کی لرزتی ہوئی لو ہے۔
جو ہوا کے ایک جھونکے میں بجھ جاتی ہے۔

وہ مقدس اور تمثیلی درخت کے سامنے تھا جس کے گھنے سائے تلے بدھ کو روشنی ملتی تھی۔ میں نے درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی نہیں تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ عظیم الشان کھمیر تہذیب کے ان شاندار کھنڈرات میں تنہا بھٹکتی ہوئی تاریکی سے میں خوفزدہ ہونے

لگی۔ راستے سکڑ کر دوبارہ ایک بھول بھلیاں میں بدل گئے۔ ہوا رک گئی تھی میرا دم گھٹ رہا تھا۔

’’آکسیجن کی جالی ٹھیک کرو، سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے‘‘ کہیں قریب کسی نے تیزی سے سرگوشی میں کہا ’’آکسیجن‘‘

ہوا میں تازگی تھی میرے اردگرد روشنی تھی میرے اوپر کھلتی ہوئی محرابیں شاندار تھیں ستون سفید، مرمر کے بنے ہوئے، سنگِ مرمر تقدس اور پاکیزگی کی ایک ملکوتی فضا کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں نہ کندہ کی ہوئی شکلیں تھیں، نہ مجسمے اور تصویریں لیکن پھر بھی اس سادگی اور پاکیزگی کا ایک اپنا متحیر خیز حسن اور جمال تھا۔ یہاں مورتیاں نہیں تھیں خارجی علامات نہیں تھے کوئی ’واسطۂ حسن قبول‘ نہ تھا لیکن ایک غیر مرئی برتر و بالا وجود جاری و ساری تھا۔ اپنے خالق سے ایک خاص اور بالراست تعلق کا احساس تھا۔

سفید بیضوی گنبد، مرمر کے ستون، پھیلی ہوئی محرابیں شفاف فانوس یہ یقیناً بادشاہی مسجد تھی ان جانی، اجنبی راہوں پر بھٹک کر میں گھر لوٹ آئی تھی۔ مرکزی قبے کے نیچے میں سجدے میں گر گئی اور خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے لگی میرا سارا وجود ایک عجیب اور انوکھی مسرت سے لبریز تھا۔ بالآخر مجھے سکون مل گیا۔

میں نے اٹھ کر اپنے اردگرد سراسیمہ ہو کر نظر ڈالی، میں کہاں تھی؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا زماں و مکاں جہت اور پیمانے سے محروم ہو کر اپنا مفہوم کھو بیٹھے تھے اور میں گویا زماں و مکاں سے گزر کر ابدیت میں داخل ہو رہی تھی۔

یا اس کے برعکس ابدیت سے نکل کر ’اب‘ اور ’موجود‘ کی دنیا میں واپس آرہی تھی؟ تمام وقت ازلی اور ابدی ’حال‘ ہے

جن راستوں سے، ہم نہیں گزرے۔
وہاں کے قدموں کی چاپ،
بازگشت بن کر یادوں میں گونجتی ہے۔

یہ نہ انیکلو ر کے سرمئی ستون تھے اور نہ بادشاہی مسجد کے سنگ مرمر کے ستون بلکہ معمولی عام قسم کے گول ستون تھے جن پر سفید اور خاکستری روغن چڑھا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کی سیال، شفاف سپیدی صرف ہسپتال کی دیواروں میں چنی ہوئی، چمکدار ٹائلز میں تھی۔ ہاں یہ بینکاک کا سیونتھ ڈے اڈونسٹ سینی ٹے ریم ہاسپٹل تھا۔

میں گویا، ابدیت کی لامتناہی وسعت کے دھندلکوں سے کھینچ کر قریبی اور متعین زماں و مکاں میں واپس لائی گئی تھی۔

ہسپتال کی لفٹ نیچے آئی اور اس سے کوئی باہر نکلا، زعفرانی عبا نہیں، سفید لباس پہنے ہوئے، میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ عیسائی مشن کی عورت تھی جو روزانہ مریضوں کے پڑھنے کے لیے اپنے مشن کا لٹریچر لاتی تھی۔ اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا کاغذ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

’خدا کی بادشاہت قریب ہے۔
مسیح موعود کا نزول قریب ہے۔

آرمیگڈان کی بین الاقوامی جنگ، دنیا کی تمام قوموں کے درمیان زبردست ٹکراؤ اور تقریباً پوری دنیا کے تہس نہس ہونے کے بعد زخموں سے نڈھال زمین کو سکون اور امن نصیب ہو گا۔

مسیح موعود کی آمد قریب ہے۔

مسیح کا نورانی شعاعوں میں زمین پر نزول ہو گا...... یہ الفاظ ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئے اور میرے ذہن میں دوسری کتابوں کے الفاظ رینگنے لگے جن میں مسیح کی دوبارہ آمد، ان کی حکومت میں امن اور خوشحالی، یوم حساب کی نزدیکی، مردوں کا زندہ ہو اٹھنا، روز جزا کا آخری انصاف جی اٹھے ہوئے مردوں کا ایک لامتناہی اندھیرے سے نکل کر حیران و سراسیمہ، الوہی نور کی خیرہ کن روشنی کے سامنے جمع ہونا۔ سب مذکورہ تھا۔

مجھے شہادت کی آرزو نہیں۔
مجھے آخری دید کی تمنا نہیں۔
مجھے صرف نفس مطمئنہ بخش دے۔

میرے سامنے پھیل ہوا خلا ایک سماوی روشنی سے معمور ہو گیا۔ طمانیت کا احساس میرے وجود میں پھیل گیا۔

روشنی کے ایک دھارے میں میری ننھی ’ریشمیں‘ میرے سامنے آئی، نومولود بچے کی شکل میں نہیں بلکہ میرے تصور کی ’ریشمیں‘ کے پیکر میں۔ گھنگریالے بالوں والی گڑیا، گلابی جھالروں کے فراک میں سر جھٹکا کر اپنے خوبصورت بالوں کے گھونگر ہلاتی ہوئی ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ لیے ہوئے۔ محبت سے بے قابو ہو کر میں نے اس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیں لیکن میری ننھی ’ریشمیں‘ گریز پا تھی وہ روشنی کے تخت پر سوار ہو کر آسمانوں میں غائب ہو گئی میری باہیں خالی کی خالی رہ گئیں۔

ساری ویرانی اور ساری تنہائی میرے اپنے اندر تھی سارا درد اور کرب پھر جاگ اٹھا یہ درد اذیت دہ تھا۔ بہت بہت اذیت دہ تھا۔ لاشعور کی وسعتوں آزادانہ گھومتا ہوا ذہن تکلیف دہ آگہی کے ایک نوکیلے نقطہ پر مرکوز کر دیا گیا۔ روح اپنی لاحاصل تلاش کے سفر سے لوٹ کر دوبارہ اپنے زنداں میں داخل ہو گئی جو میرا جسم تھا۔

میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ روشنی میری کمزور آنکھوں کو تکلیف دے رہی تھی۔ 'روشنی' آپریشن کی میز پر پڑتی ہوئی خیرہ کن، بے رحم اور آنکھوں کو اندھا بنانے والی روشنی تھی 'طمانیت' مارفیا یا کوئی اور خواب آور دوا تھی جو میرے درد کی شدت کو کم کرنے لیے دی گئی تھی لیکن کوئی مارفیا اس درد کو مٹا نہیں سکتا تھا جو میرے اپنے اندر موجود تھا، میرے وجود کی گہرائی میں زندہ تھا۔

میرے نفس نے آزاد ہو کر عالمگیر ویرانی اور تنہائی کا جو تصور دیکھا تھا وہ دراصل میرے اپنے شدید اندرونی احساس کا اظہار تھا جیسے جیسے آہستہ آہستہ میرے حواس مجتمع ہوتے گئے۔ ویرانی اور اجاڑ پن کا کائناتی احساس سمٹ کر ایک شدید ذاتی المیے میں ڈھل گیا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا آپریشن تھیٹر کے باہر اذیت دہ انتظار کا اعصابی تشنج ختم ہوا اور وہ اندر داخل ہوئے لیکن ڈاکٹر نے مماثلتی انداز میں ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور الگ لے گیا میں ڈاکٹر سرگوشیانہ لہجے میں گفتگو سن سکتی تھی۔ 'مجھے افسوس بچہ کو بچایا نہیں جاسکا۔ ہم نے دل کے مساج کا طریقہ بھی آزمایا مگر بے کار۔ آخری لمحہ تک ہم اس کے دل کی دھڑکن پر کان لگائے رہے وہ زندہ تھا۔ موت پیدائش کے فوراً بعد ہوئی ایک طرح سے پیدائش اور موت دونوں ایک ساتھ واقع ہوئیں'

صمیم دل سے مانگی ہوئی آخری دعا نے شاید یہ ننھی زندگی ایک دوسری زیادہ 'قیمتی' زندگی کے بدلے میں بھینٹ دے دی تھی۔

کیا دل کی گہرائیوں سے مانگی ہوئی وہ دعا قبول ہوئی تھی ان کی کربناک اور مضطرب آنکھیں میری طرف پلٹیں۔

ڈاکٹر نے جلدی سے انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی اب یہ ٹھیک ہیں آہستہ آہستہ ہوش آرہا جلد ہی انھیں ان کے اسپیشل وارڈ میں منتقل کردیا جائے گا اور آپ ان سے بات کرسکیں گے اس ابتلا سے وہ بڑی ہمت سے گزریں بڑا پیچیدہ اور خطرناک کیس تھا لیکن اب خطرے کی سرحد پار ہوگئی ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سیزیرین آپریشن بذاتہ خطرناک نہیں ہوتا گو کہ بڑا آپریشن ہے کیونکہ شگاف براہ راست پیٹ کے اندر اترتا ہے لیکن آج کل سلفا ڈرگس اور اینٹی بائیوٹکس کے اس دور میں سمیت پھیلنے اور موت کے خطرات بالکل دور ہوگئے ہیں آپ کی بیوی خطرے سے باہر ہیں۔ ابھی ان کی حالت بہت نازک ہے اور انتہائی حفاظت اور نگہداشت کی ضرورت ہے بچہ کی موت کے بارے میں انھیں ابھی نہ بتایا جائے تو بہتر ہوگا۔'

میرے دل پر سردی کی ایک تہہ سی چڑھ گئی میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ میرے سینے میں جو نئی محبت کا شعلہ بھڑکا تھا وہ سرد ہوگیا۔

موت مجھے چھوتے ہوئے گزر گئی لیکن جاتے جاتے وہ تاوان میں اس ننھی سی زندگی کو لے گئی جو میرے اندر متحرک تھی وہ ننھا وجود اپنی نشوونما کی ساری منزلوں میں میرے تخیل میں اتنا واضح طور پر موجود تھا۔ اس کی تقدیر میں صرف ایک لمحہ کی زندگی تھی۔

میں نے زندگی کو نہیں، موت کو جنم دینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی میں میں ندامت اور غم کے احساس میں ڈوب گئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں آنسوؤں کے پاس بھی اس درد کا علاج نہیں تھا۔

میں تنہا تھی، اپنے کرب اور غم کے ساتھ، بالکل تنہا۔

میں اس ساری قیامت سے موت کے لیے گزری تھی یا پیدائش کے لیے۔؟ پیدائش ہوئی یقیناً لیکن۔

یہ پیدائش میرے واسطے موت کی طرح سخت اور تلخ اذیت بن گئی۔

یہ بہت بڑا کفارہ تھا۔ اس کفارے کے لیے مجھے کیوں منتخب کیا گیا؟

فرہنگ آصفیہ سے

آڑت۔ یا آڑھت -ہ۔ اسم مؤنث۔ س۔ ہ۔ ٹھہرنے کی جگہ۔ ساہوکاروں کی معتمد علیہ کی جگہ۔ بیوپاریوں کا مال آکر اترنے اور بکنے کی جگہ۔ (۱) کمیشن فیس۔ دستوری۔ بکوانے کی اجرت۔ تلوائی بکوا دینے کا حق۔ حق دلالی۔ وہ روپیہ جو معرفت داری کے عوض مہاجن لوگ دیتے ہیں۔ ہنڈاون۔ حق السعی۔ محنتانہ۔ فیصدی۔ منہائی (۲) لین دین۔ حساب کتاب کوٹھی سال کی آمد و رفت۔ مال کی چھٹی پتری۔ (فقرہ) اس مہاجن کی بھی دور دور آڑت ہے اگرچہ متن میں اس لفظ کا مادہ بیم صاحب کے گر ہمر سے دیا گیا ہے مگر ہماری رائے میں اس کا ٹھیک مادہ آڑ اور ہاٹ بمعنی وہ دوکان یا دوکاندار جس کی دوکان پر مال آکر اترے اور وہ اس کی آڑ یا ضمانت ہو کیونکہ آڑ بمعنی ذمہ داری اور ہٹ مخفف ہاٹ ہے۔

آفتاب بام یا لب بام یا سر کوہ -ف۔ محاورہ۔ (خاص خاص آدمی بولتے ہیں) وہ شخص جس کے مرنے کے دن قریب آگئے ہوں۔ نہایت بوڑھا۔ چراغِ صبح۔ چراغِ سحر۔ قریب الزوال۔ عمر رسیدہ۔ چند روزہ مہمان دنیا۔ وہ شخص جس کی عمر کا اخیر زمانہ ہو

کہانی

ان بن

ندیم غوری

شادی کے بعد وہ پہلی ملاقات تھی۔ ابرار نے بغل میں بیٹھتے ہوئے جتنی تعریفیں، تشبیہات، مثالیں وغیرہ یاد تھیں اور پھر جیسے جیسے مزید یاد آتی گئیں، یکے بعد دیگرے سب سناتے رہے اور آخر میں کہا، لگتا ہے گھونگھٹ کی رنگین گھٹا میں گویا ماہِ تمام اُتر آیا ہو۔ اس طرح آہستہ آہستہ اجنبیت کے پردے سرکتے رہے اور بات چیت میں بھی رکاوٹ معدوم ہوتی گئی۔ اب ابرار کو یہ کرید تھی کہ اس کے بارے میں جواباً کوئی مکالمہ مسموع نہ ہوا سو انہوں نے دریافت کیا شبّو (شبانہ) جی ہم نے آپ کے بارے میں جو دیکھا جو محسوس کیا سو اس کا برملا اظہار کر دیا، مگر اب تک ہم خود اپنے بارے میں آپ کی رائے کے محض منتظر ہیں، تو نازک سی کلیوں سے یہ ترنم خیز صدا سنائی دی کہ جو بے مثال ہو اس کی مثال ہم کہاں تلاش کریں۔ یہ تعریف سن کر ابرار خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔

دوسرے دن شادی کی اس گہما گہمی، دوستوں کی خوش گپیوں، خفیہ واردات کی پوچھ تاچھ، چٹکیاں، ہنسی مذاق کا دور دورہ تھا۔ ادھر سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ، استفسار، نقرئی قہقہے و زمزمے دن تمام چلتے رہے اور شام مغرب بعد پر تکلف ولیمہ کا اہتمام تھا۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ دلہن والے نوشہ میاں کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ ادھر دُلہے کے والدین عزیز و اقارب بھی دلہن بیگم کی تعریف میں رَطبُ اللسان تھے۔ لیکن دنیا میں شادی و غم کے سلسلے کو کبھی قرار نہیں۔ اس لیے یہ سلسلہ بھی تھمتا گیا اور زندگی پھر معمول کے مطابق گزرنے لگی۔

ابرار نے میکانیکل انجینئرنگ کے فائنل امتحان امتیازی درجہ میں پاس کیا تھا۔ اس لیے ایک انٹرنیشنل کمپنی نے انہیں معقول ماہانہ یافت پر اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی تھی جسے ابرار نے قبول کر لیا تھا۔ جبکہ شبانہ ایک مقامی جونیئر کالج میں تاریخ و ادبیات کی لیکچرر تھیں۔ اس طرح یہ کنبہ اعلیٰ اوسط طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ ابرار اپنی کار میں شبانہ کو کالج ڈراپ کرتے پھر اپنے آفس روانہ ہوتے۔

ابرار کے پڑوس میں ان کے بچپن کے دوست مدار رہتے تھے۔ بلحاظ پیشہ وہ کباڑی تھے ساتھ میں رڈی کا کاروبار بھی خوب چلتا تھا۔ روزانہ ہزار ہا روپیہ کا ٹرن اوور تھا۔ خوب کما لیتے تھے۔ بہر حال عیش میں گزر رہی تھی۔ ہر معاملہ خود طئے کرنے کے عادی، ماتحتوں اور مزدوروں کو معاملات سے دور ہی رکھتے تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ ممبئی گئے ہوئے تھے پھر بنگلور، چنئی اور کولکتہ ہوتے ہوئے شہر واپس ہوئے تھے۔ اس ٹور میں کئی دن نکل گئے اس لیے وہ ابرار کی شادی میں شرکت نہ کر سکے۔ ویسے ان کی اہلیہ صفیہ بیگم شادی میں ضرور شریک رہیں۔

ٹور کے اختتام پر مدار صاحب جب واپس ہوئے تو بلا تاخیر ابرار سے بغرض ملاقات و مبارکباد معہ تحائف اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ دروازہ ابرار نے ہی کھولا اور مدار پر نظر پڑتے ہی بے دھڑک نعرہ لگایا اخاہ! مدار بھائی اور گلے لگا کر بڑی دیر تلک پیٹھ تھپکتے رہے اور پھر الگ ہو کر چشم پرنم سے کہا مدار بھائی آپ کی غیر حاضری بڑی کھلتی رہی ہر خوشی دکھ دے رہی تھی۔ یہ شور سن کر شبانہ حجلۂ عروسی سے نکل کر دیوان خانے کے پردے کی اوٹ سے متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ ابرار کو جھانکتی نظروں کا احساس ہو چکا تھا۔ انہوں نے کہا شبانہ یہ میرے عزیز ہیں ان سے کیا پردہ دیکھو یہ تمہارے لیے کیا کیا تحائف لائے ہیں۔ آپ یہاں آجایئے۔ شبانہ نیچی نگاہوں اور آہستہ قدموں سے داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر مدار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بہر حال انہوں نے اپنی حالت پر قابو پا لیا اور دونوں کی گلپوشی کر کے تحائف پیش کیے۔ شبّو شکریہ ادا کر کے اندر چلی گئیں۔ اب ابرار اور مدار بات چیت میں محو ہو گئے لیکن ابرار نے مدار کی فکر مندی کو محسوس کر لیا اور پوچھا کیوں یار

بھابی پسند نہیں آئی تم تو ایسے چپ ہو گئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ مدار نے چونک کر کہا یار بھابی تو اتنی خوبصورت ہیں کہ انہیں دیکھ کر کسی کی بھی زبان گنگ ہوسکتی ہے۔ میری کیا بساط۔ ابرار غور کرنے لگے لیکن شبانہ نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا تھا۔ وہ نارمل تھیں۔ اتنے میں چائے آگئی اور چائے نوشی کے بعد مدار نے فوری اپنی راہ لی۔

مدار تو چلے گئے اور اب ابرار فکر مند ہوگئے۔ وہ مدار کی فکر مندی کے پس منظر میں وجوہات تلاش کرنے لگے لیکن وہاں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اُدھیڑ بُن میں وہ دیوان خانے کا بیرونی دروازہ بند کر کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اماں کچھ کپڑے حمام میں لے جارہی ہیں۔ ابرار نے پوچھا ممی کیا کررہی ہو۔ بیٹا یہ دو کپڑے دھونا ضروری ہیں اور آج صابرہ چھٹی پر ہے۔ یہ سن کر ابرار کمرے میں شبانہ کے قریب آئے اور کہا شبّو دیکھو، ممی کپڑے دھو رہی ہیں۔ وہ واشنگ مشین آپریٹ کرنا نہیں جانتیں اور میرا وہاں جانا مناسب نہیں۔ اک ذرا زحمت تو ہوگی اگر تم ان کی کچھ مدد کردو۔ ٹھیک ہے اب کی بار مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن میری یہ عین گزارش ہے کہ اس ناچیز کی خدمات آپ ہی تک محدود رہیں تو مناسب ہوگا۔ مدار کے لیے یہ دوسرا صدمہ تھا۔ ان کے ذہن میں اک اور شبہ رینگ گیا کہ غالباً مدار اس لیڈی کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہے تبھی تو اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ صبر کے گھونٹ پی گئے کہ نئی دلہن سے کہاں حجت کریں، ابھی تو بہت کام باقی ہے۔

شبو جب واپس آئیں تو ان کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ ویسے ابرار کا موڈ بھی کون سا ٹھیک تھا۔ مگر انہوں نے ضبط کرتے ہوئے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی اور کہا شبّو غصہ میں تم اور بھی حسین لگ رہی ہو۔ تو وہاں سے فوری پلٹ وار ہوا انتہائی گھسا پٹا مکالمہ ہے اور کتنی چوکھٹوں پر ایسی صدائیں بلند کرچکے ہو۔ یہ سن کر ابرار کا چہرہ لٹک گیا اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر لیٹ گئے۔ چھٹی کا وہ دن ایسی ہی بدمزگی میں گزر گیا۔ سرِشام وہ قریبی باغ میں ٹہلتے ہوئے فکرمندی میں سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لینے لگے۔ ان کا موڈ سگریٹ کے مشتعل سرے کے مانند تھا لیکن باغ میں نسیم برّی سے مزاج میں کچھ اعتدال آیا اور پھر وہ گھر لوٹ آئے۔ حجرے میں ابھی قدم ہی رکھا تھا کہ آواز آئی سگریٹ دُھنک کر آرہے ہو؟ ابرار نے چونک کر دیکھا اور کہا تم نے اتنی دور سے بوباس سونگھ لی! کمال ہے تمہیں تو پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اسے تعریف سمجھ کر مسکرانے لگیں لیکن جلد ہی غالباً مطلب کچھ کا کچھ سمجھ میں آیا۔ ڈپٹ کر پوچھا پولیس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ ابرار نے جواب دیا یہی کہ تم ماشاءاللہ پی جی ہو، انسپکٹر کی پوسٹ تو مل ہی جاتی۔ کیوں کیا خیال ہے۔ تمہارے خیالات تمہاری حرکتوں کی طرح سمجھ میں آرہے ہیں۔ ابرار نے سمجھاتے ہوئے کہا اماں! کیوں دن کی طرح رات بھی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ چلو آرام کرتے ہیں ع

جب گلے ملتے گئے سارا گلا جاتا رہا۔

آج اتوار ہے۔ ابرار کی کانوں میں میٹھی میٹھی آوازیں آنے لگیں۔ اٹھئے بھی صبح ہوچکی دیر تک سونا رزق میں رکاوٹ کا سبب ہوتا ہے۔ ابرار کی آنکھیں کھل گئیں تو دیکھا کہ ان کے چہرے پر زلفیں تمام تر بید مجنوں کی طرح سایہ فگن ہیں اور جن کے گھنے سایہ میں کوئی نکھرا ہوا مطمئن چہرہ اپنی بہار دکھلا رہا ہے۔ یہ رونق افروز سماں دیکھ کر ابرار کے ہونٹوں پر یہ شعر جاری ہوگیا۔

نیند اسکی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

بہرحال صبح صبح اپنائیت اور یگانگت کا اک سماں سا بندھ گیا۔ ابرار نے شبو کا خوشگوار موڈ دیکھ کر پوچھ ہی لیا شبو، شادی سے پہلے تم مدار سے واقف تھیں۔ شبو نے اپنی جھیل جیسی گہری آنکھیں ابرار کی جانب موڑ کر کہا نہیں تو! کبھی نہیں۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ ابرار نے کہا نہیں یونہی اس دن وہ تمہیں دیکھ کر ٹھٹک سا گیا تھا۔ اس لیے مجھے گمان ہوا کہ شاید اس نے کبھی کہیں تمہیں دیکھا ہو۔ شبو نے پھر پوچھا کیا انہوں نے ایسا کچھ کہا ہے۔ ابرار بولے جی نہیں ایسا تو کچھ کہا نہیں۔ شبو نے زلفیں پیچھے کی جانب جھٹک کر کہا مردوں کا خاصہ شک کے سانچہ میں ڈھلتا ہے۔ اتنے میں ابرار کے فون کی گھنٹی بجی تو اس پر مدار کا نام اُبھر آیا۔ ابرار بولے لیجیے شیطان کا ذکر کیا نہیں اور وہ موجود ہوا نہیں۔ انہوں نے خیریت معلوم کی اور آدھے پون گھنٹے بعد ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ابرار بولے مدار بھائی آپ جب چاہیں تشریف لاسکتے ہیں نگاہیں فرش راہ ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد مدار بھائی کی آمد ہوئی۔ کچھ رسمی بات چیت کے بعد ٹی پاٹ معہ لوازم کے آیا۔ چائے کا دور چلتا رہا۔ مدار نے اپنائیت ظاہر کرتے ہوئے کہا ابرو بھائی آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کا یہ رشتہ کیسے طئے ہوا، کس نے کیا، کچھ خبر ہی نہیں۔ ابرار نے انہیں ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا بھئی یہ سب کچھ فی الفور ہوگیا۔ دراصل میں اپنے تقرر کی خوش خبری لیکر خالہ ممی کے گھر پہنچا۔ وہاں یہ محترمہ بھی اتفاق سے چاند بی بی جونیئر کالج میں اپنے اپائنٹمنٹ آرڈر کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ وہ خالہ ممی کے پڑوس میں ہی رہتی تھیں۔ خالہ ممی نے ہمارا آپس میں تعارف کرایا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ وہ میرے

سراپے کا جائزہ لیتی رہیں اور ابھی آتی ہوں کہہ کر چلی گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے خالہ ممی کو بلا بھیجا۔ وہ گئیں اور کچھ دیر بعد مجھے بھی بلا لیا۔ وہاں اچھی خاصی ضیافت تھی اور ہماری گلپوشی بھی کی گئی۔ خالہ ممی نے کہا ماشاء اللہ کیا خوبرو جوڑا ہے۔ کیوں نہ ابھی ان کی منگنی کرادی جائے۔ یہ سن کر شتو شرما کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔ خالہ ممی نے مجھ سے علاحدگی میں کہا بیٹا میں نے ابھی تمہاری ممی سے فون پر بات کی لڑکی ان کی دیکھی ہوئی ہے۔ اگر تم کہو تو بات آگے بڑھادیں۔ میں نے کہا بات آپ نے بڑھا تو دی اب میں بزرگوں کے خلاف کیسے جاسکتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں امی جان بھی آگئیں اور انگوٹھیاں بھی۔ ہمارے ساتھ ساتھ سب بہت خوش ہوئے اور اسی بیٹھک میں شادی کی۔ تاریخ بھی طئے ہوگئی جبکہ تم ٹور پر روانہ ہوچکے تھے۔ نالائق کہیں کے۔ یہی تمام تر روداد ہے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ تم شبانہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے اور تمہارے برتاؤ سے ظاہر ہورہا تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ اگر تم میرے دوست برادر ہو تو میرے شبہات کو دور کردو۔ مدار نے ہلکے سے اپنا اوپری ہونٹ اوپر کھینچ کر کچھ بدمزگی کا اظہار کیا اور کہا کہ تم سے چھپانا بھی مشکل اور ظاہر کرنا بھی دشوار سوچتا ہوں۔ کہیں تم دونوں میں ان بن نہ ہوجائے۔ خیر اب میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر ہی دوں اور اپنی ساری قوتِ گویائی مجتمع کرکے کہا کہ بھابی کے رشتہ کے کوئی بھائی فرخ ہیں جو ان کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ ایک دن فرخ نے میرا کوئی اشتہار دیکھ کر فون کیا کہ گھر میں کچھ ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، ٹیبل کار، اسکوٹر کے پھٹے پرانے ٹائر، زنگ آلود ٹولس، بگڑے ہوئے آٹھ دس موبائلس وغیرہ وغیرہ پڑے ہوئے ہیں۔ مناسب قیمت لگا کر خرید لیں۔ میں حسب وعدہ اس کے گھر پہنچا، مگر کمرے سے اونچی اونچی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے کھڑکی کے روزن سے بڑی ترکیب سے جھانک کر دیکھا تو عین اسی وقت بھابی نے فرخ کو چانٹا جڑ دیا اور بلند آواز سے کہا کہ اگر تو نے ذرا بھی بیہودگی کی تو تیرے جعلی سرٹیفکیٹ کی رپورٹ یونیورسٹی، پولیس اور تیرے محکمے کو کردوں گی، تو ہے کس خیال میں، جیل کی ہوا نہ کھلادوں تو میرا نام نہیں، یہ کہہ کر دندناتی ہوئی چل دی۔ میں وہاں سے رفو چکر ہوگیا اور بڑی دیر بعد فرخ کو فون کیا کہ میں تو آچکا ہوں لیکن آپ کا مکان نہیں مل رہا ہے۔ اس نے کہا پانی کی ٹنکی کے قریب جو سب سے بڑی بلڈنگ ہے وہی ہمارا غریب خانہ ہے۔ بے دھڑک چلے آئیں۔ پھر بھی میں کوئی آدھا گھنٹہ بعد پہنچا۔ وہ کافی ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ کبھی کچھ اِدھر رکھتا تو کچھ اُدھر۔ میں نے اسے کباڑ دکھانے کے لیے کہا۔ سامان دیکھ کر میں نے اس کی قیمت پچیس ہزار روپیہ آنکی۔ وہ چالیس ہزار کہہ رہا تھا مگر بتیس ہزار میں معاملہ طئے ہوگیا۔ میں نے سارا کباڑ اٹھوایا اور ادائیگی کرکے آفس اور گودام چلا آیا۔ ابھی تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ فرخ دیوانہ وار دندناتا ہوا آیا۔ بدن تمام پسینے سے شرابور اور کنپٹی کی رگیں پھڑکتی ہوئی علانیہ نظر آرہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا مدار بھائی میرا موبائل مکان میں کہیں مل نہیں رہا ہے۔ تمہارے کباڑ میں تو نہیں آگیا۔ میں نے سارا سامان موبائلس سمیت اس کے سامنے رکھ دیا کہ دیکھ کر تسلی کرلیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے دلاسا بھی دیتا جاتا کہ اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ کہیں بے خیالی میں رکھ دیا ہوگا، مل جائیگا۔ شیطان نے اس پر ہاتھ رکھ دیا ہوگا، اس لیے آنکھوں سے اوجھل ہے۔ لاحول پڑھو اللہ پاک مشکل آسان کردیگا۔ میں بھی اس کے ساتھ تلاش کرتا رہا لیکن وہ مسلسل روئے جارہا تھا۔ میں نے کہا اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایسا کون سا بہت قیمتی مال ہے جو نہ مل سکے گا۔ وہ بلک بلک کر کہہ رہا تھا نہیں مدار بھائی اس میں بڑے قیمتی حسابات تھے۔ وہ بڑی دیر تک سارے کباڑ اور دفتر کی چھان بین کرتا رہا اور بار بار کہتا میں لٹ گیا برباد ہوگیا، میں نے پھر اسے دلاسا دیا اور یہ بھی اطمینان دلایا کہ خاطر جمع رہیں۔ اگر مل یہاں مل جائے تو ملتے ہی پہنچادوں گا۔ جب وہ تلاشی لیکر تھک ہار گیا تو اسے اپنی کار میں چھوڑ آیا۔ پھر مدار نے گہری گہری سانسیں لیں اور جیسے تیسے چائے کا آخری گھونٹ لے کر جلد ہی ملنے کا وعدہ کرکے پرنم آنکھوں سے چل دیا۔

ابرار کو اس کا قلق تھا کہ اتنی اہم بات ان سے پوشیدہ رکھی گئی۔ دیوان خانے سے جب وہ مکان میں داخل ہوئے تو ان کی کیفیت نڈھال سی تھی۔ شبانہ نے سُتا ہوا چہرہ دیکھ کر ہمدردی جتائی۔ پوچھا طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ دوپہر ہورہی ہے۔ لنچ نہیں کروگے۔ یہ آوازیں انہیں کہیں دور کسی صحراء سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ انہوں نے مغموم آواز میں دریافت کیا امّی جان کہاں ہیں؟ وہ خالہ ممی کے گھر گئی ہیں۔ کہا کہ شام تک لوٹیں گی۔ آج صابرہ بھی غائب ہے۔ کھانا میں تیار کرچکی ہوں۔ لگا دوں؟ بھوک تو محسوس نہیں ہورہی تھی تاہم سوچا کچھ تو زہر مار کر ہی لیتے ہیں اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ سامنے کانچ کے خوشنما نقشی کٹورے رکابیاں وغیرہ قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ شبانہ نے چمچ سے سالن کو حرکت دیتے ہوئے کہا بھینڈی گیار ہوئی ہے۔ پراٹھوں اور زیرہ رائس کے ساتھ خوب مزہ دیگی۔ ابرار ویسے ہی غصے سے بھرے ہوئے تو تھے ہی رنجیدہ لہجے میں پوچھا تمہیں اور کوئی سبزی نہ مل سکی جو لیسدار بھینڈی بنادی ۔ مجھے تو اس کے خیال سے ہی کراہیت ہوتی ہے۔ کوئی اور چیز انڈا یا دہی وغیرہ جو بھی شبانہ نے کہا کچھ بھی نہیں ہے۔ فریج خالی پڑا ہے ورنہ بھینڈی

ہی کیوں بناتی ۔ ویسے بھینڈی کمر اور بدن کے لیے مقوی ہوتی ہے اور مجھے پسند ہے ۔ ابرار نے سنی ان سنی کر کے کہا آئندہ کبھی بھینڈی کا ساگ میرے سامنے نہ آئے، خیال رہے ۔ انہوں نے پلیٹ میں صرف شوربہ لے کر لقمہ اُٹھانے کا قصد کیا ہی تھا کہ ہاتھ روک کر شبانہ سے کہا تم لنچ نہیں کروگی ۔ شبانہ نے کہا مجھے قطعی بھوک نہیں ہے اور وہاں سے چل دی ۔ ابرار نے ایک لقمہ لیا اور ویسے ہی پلیٹ میں تھوک دیا اور چیخنے لگے پانی... پانی، پھر خود ہی گلاس بھر کر غٹ غٹ چڑھا گئے ۔ اتنے میں شبانہ دوڑی دوڑی آئیں ۔ کیا ہوا ۔ ابرار نے تیکھے لہجہ میں کہا کیا ہوا؟ ارے مرچ کا پورا مرتبان ہی سالن میں جھونک دیا ۔ شبانہ نے تعجب سے کہا نہیں تو! اور سالن چکھ کر دیکھا مناسب تو ہے ۔ اتنی ہی مرچ ڈالی جاتی ہے ۔ میں پکوان سے بخوبی واقف ہوں ۔ ابرار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ڈائننگ ٹیبل پر کٹورے، رکابیاں، چمچے سب کچن کی دیوار پر دے مارا ۔ بڑا چمچ جھنجھنا کر لرزتے ہوئے کونے میں ٹکرا کر خاموش ہوا اور کٹورے اور رکابیاں پاش پاش ہو کر کچن کے فرش پر بڑی آواز کے ساتھ پھیل گئے اور درمیان میں سالن کا شوربہ اور بھینڈی کے ٹکڑے جا بجا پڑے ہوئے تھے ۔ شبانہ کو بھی یہ دیکھ کر تاؤ آیا ۔ انہوں نے رعونت سے کہا: اے مسٹر! یہ برتن میرے جہیز میں آئے ہیں ۔ تمہیں انہیں برباد کرنے کا کوئی حق نہیں ۔ غصہ اگر اتارنا ہی ہے تو اپنی چیزوں پر اتاریں ۔ اتنا شاندار سیٹ برباد کر کے رکھ دیا ۔ جنگلی کہیں کے ۔ ابرار اس طرز تخاطب پر برافروختہ ہو گئے اور کڑک کر کہا ٹھیک ہے، ہم لوگ کیوں نہ علاحدہ ہو کر اپنی اپنی چیزوں کی خود حفاظت کریں ۔ شام قاضی صاحب کو بلا لیتے ہیں ۔ کاش قبل از قبل اچھی طرح چھان بین کر لیتے تو یہ تماشہ دیکھنے کو نہ ملتا ۔ شام تک تم اپنا سامان سمیٹ کر تیار رہو ۔ شبانہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا شام کس نے دیکھی ہے میں ابھی سے تیار ہوں اور گھر فون کر کے ٹرک کا بندوبست کرنے کے لیے حکم صادر کرنے لگیں، لیکن ادھر صرف گھنٹی بجتی رہی، کسی نے ریسیو نہیں کیا ۔ ادھر ابرار غصے میں بھرے ہوئے قاضی صاحب کو فون پر اپنا نام اور پتہ بتا کر علاحدگی کے کاغذات کے ہمراہ شام گھر آنے کی درخواست کرنے لگے ۔

عصر کے بعد قاضی سید عبدالکریم صاحب تشریف لائے اور کہا کہ علاحدگی کے تمام تر کاغذات تیار ہیں مگر میں اپنے طور پر اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ فریقین اپنی اپنی روداد بیان کریں اور درمیان میں دخل اندازی نہ کریں، ٹھیک؟ ہاں تو محترمہ آپ اپنی بپتا بیان کریں ۔ شبانہ نے اپنی شکایت میں کہا کہ:

1 - موصوف کا برتاؤ تحکمانہ اور اندازِ تخاطب نہایت اہانت آمیز رہتا ہے ۔

2 - مجھے ملازمت کے ساتھ ساتھ اکثر گھر کا کام بھی سونپا جاتا ہے اور ادنیٰ نوکرانی سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جاتا ہے جو میری برداشت سے باہر ہے ۔

3 - ہر ماہ میری تمام تر یافت بڑی سختی سے چھین لی جاتی ہے پھر کالج کی آمدورفت کے لیے کوئی سواری بھی میسر نہیں ہے ۔

4 - انہیں سگریٹ نوشی کی گندی عادت ہے، جس کی وجہ سے میرا دم گھٹا جاتا ہے ۔ شکایت کرنے پر جسمانی ایذا پہنچائی جاتی ہے ۔

5 - میرا مہر پانچ لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت ابھی تک وصول طلب ہے اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب ساتویں پے کمیشن کے بقایاجات مل جائیں تو اسی کو مہر تصور کرلیں ۔

یہ احوال سن کر قاضی صاحب ابرار کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا کہ پہلے آپ الزامات کی صفائی پیش کریں اور اس کے بعد اپنے اعتراضات بیان کریں ۔ چنانچہ ابرار یوں گویا ہوئے ۔

1 - پہلی شکایت کے جواب میں ادباً عرض ہے کہ محترمہ کی مخاطبت سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رویہ کس کا تحکمانہ ہے اور وہ کس حد تک دوسروں کا احترام کرسکتی ہیں ۔

2 - گھر کے کام کاج کے لیے ہمارے گھر صابرہ بیگم بطور کل وقتی خادمہ مقرر ہیں ۔ کبھی وہ رخصت پر ہوں تو والدہ صاحب خود ہی تمام انتظامات کردیتی ہے ۔ البتہ یہ محترمہ کبھی گھر کے کام کاج میں دخل اندازی کر کے کام چوپٹ کردیتی ہیں ۔ آج ہی سالن میں اتنی مرچ جھونک دی کہ توبہ بھلی ۔

3 - جہاں تک ان کی یافت ہڑپنے کا تعلق ہے اس کے لیے ان کے بنک کی پاس بک برائے ملاحظہ پیش ہے جس میں از اوّل تا اب تک کامل اندراجات جوں کے توں موجود ہیں ۔ آمدورفت کے لیے کار تو موجود ہے، پر یہ ڈرائیونگ سے ناواقف ہیں ۔ اس لیے اس خادم کو ہی یہ ڈیوٹی روزانہ صبح شام انجام دینی ہوتی ہے ۔

4 - اگر مجھے سگریٹ نوشی کی لت ہے تو یہ بتائیں کہ میرا برینڈ کیا ہے، یا کم از کم ایش ٹرے گھر میں رکھا تو ہوگا وہی لاکر بتادیں ۔

5 - مہر کی بابت اس بیگ میں کل پانچ لاکھ روپیہ موجود ہیں گن کر تسلی کرلیں ۔ اب ان کے خلاف ہمارا الزام محض اتنا ہے کہ ان کے رشتہ دار فرخ سے ان کے روابط کس نوعیت کے ہیں اور کہ نقلی اسناد کا کیا چکر ہے ۔ افسوس ہے کہ اتنی اہم باتیں ہم سے مخفی رکھی گئیں ۔ اس کے علاوہ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں بلکہ ان کی نادانیاں بھی ان ہی کی طرح دلفریب ہیں ۔

قاضی صاحب نے فرمایا محترمہ اس الزام کی صفائی پیش کریں ۔

شبانہ نے آبدیدہ ہوکر کہا یہ میری زندگی کا سیاہ باب ہے مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ فرخ ہمارا رشتہ دار تھا۔ تعلیمی اعتبار سے وہ نان میٹرک ہے، مگر ایک دن اس نے خوشخبری سنائی کہ اسے کارپوریشن میں کلرکی مل چکی ہے۔ یہ سنتے ہی میں بات کی تہہ تک پہنچ گئی کہ یہ جعلسازی کا معاملہ لگتا ہے۔ اتفاق سے میں ایک دن گھر کے میونسپل ٹیکس کی ادائیگی کے لیے کارپوریشن گئی۔ تو پتہ چلا کہ موصوف کو بی-اے کے سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر یہ جائداد ملی ہے۔ اس طرح میرے شبہ کو تقویت پہنچ گئی چونکہ اس کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر اس بدخصلت نے بوقت غسل نہ جانے کب اور کیسے قابل اعتراض سین اپنے موبائل میں قید کر لیے اور جب اس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو جعل سازی کی بنیاد پر میں نے اسے جھٹک دیا اور اس سے سخت پردہ کر لیا۔ اس کے بعد جب ابرار سے اتفاقاً ملاقات ہوئی تو ان کی وجاہت اور اعلیٰ ملازمت کی بنا پر مجھے مکمل تحفظ کا احساس ہوا۔ اس لیے میں نے ان کا رشتہ قبول کر لیا جو فی الواقعی بڑی بھول تھی۔

مولانا سید عبدالکریم صاحب نے تبسم فرمایا اور کہا فریقین نہایت ہی بودے الزامات رکھتے ہیں۔ بے عیب خدا کی ذات، اس لیے آپس میں صلح صفائی کر لیں۔ لیکن ابرار نے یہ اعتراض پیش کیا کہ اگر فرخ نے انہیں بدنام کرنے کی مہم چلائی تو پھر یہ ملازمت نہیں کر پائینگی اور مجھے بے انتہا شرمندگی اور بدنامی جھیلنی پڑے گی۔ اسی وقت اچانک مدار داخل ہوئے اور کہا کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ وہ موبائل جس میں مختلف لڑکیوں کی کوئی آدھا درجن بے حجاب تصاویر کھینچی گئی ہیں ان میں صرف ایک ہی تصویر بھابی صاحبہ کی نظر آئی۔ اب میں یہ موبائل بھابی صاحبہ کے حوالے کرتا ہوں تاکہ وہ اپنی تصویر شناخت کر لیں اور پھر تمام تصاویر کو ڈیلیٹ کر دیں۔ شبانہ نے تصویر دیکھ کر کہا ہاں یہی تو تصویر دکھا کر وہ مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔ ابرار نے ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر حیرت سے پوچھا مگر مدار یہ موبائل تمہیں ملا کیسے؟ مدار گویا ہوئے ابرو بھائی دراصل یہ اتفاق سے میرے ہاتھ آ گیا، یعنی جب میں اپنے کباڑ کی ڈلیوری لینے فرخ کے گھر پہونچا تو اس نے مجھے دیوان خانے میں بٹھا کر کچھ تواضع کی خاطر مکان میں چلا گیا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ صوفے کے سامنے چھوٹی سی میز پر اخباروں میں یہ ہینڈسیٹ پڑا ہوا ہے جو ہو بہو میرے ہینڈسیٹ جیسا ہے۔ میک بھی بالکل وہی۔ دراصل میں اپنا موبائل گھر پر ہی بھول آیا تھا اور اس موبائل کو اپنا ہی موبائل سمجھ کر جھٹ سے سفاری سوٹ کے اوپری جیب میں ڈال دیا۔ اس کے فوری بعد فرخ دیوان خانے میں داخل ہوا جس کے پیچھے ایک ملازمہ کافی کے ساتھ ساتھ لوازمات کی ٹرے لے کر داخل ہوئی۔ کافی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے فرخ سے رخصت لی اور اپنی ٹو وھیلر پر گھر کے لیے روانہ ہوا وہاں ذرا فریش ہوکر ڈریس تبدیل کیا اور بذریعہ کار اپنے آفس اور گودام پہنچا ہی تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ فرخ دیوانہ وار دوڑتا چلا آ رہا ہے اور پاگلوں کی طرح اپنا موبائل تلاش کر رہا ہے۔ میرے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہ تھا کہ اس کا موبائل میرے سفاری سوٹ کی جیب میں پڑا ہے۔ میں نے کسی طور اسے دلاسا دیکر روانہ کیا۔ پھر میں اس واقعہ کو بھول بھال گیا تو آج صفیہ نے مجھے یہ کہہ کر یہ موبائل حوالے کیا کہ اگر یہ کپڑوں کے ساتھ واشنگ مشین میں چلا جاتا تو دُھل کر چوپٹ ہو جاتا۔ میں نے بڑی حیرانی سے یہ موبائل صفیہ کے ہاتھ سے لیا کہ آخر میرا اجڑ واں موبائل کہاں سے وارد ہوا۔ بہر حال میں نے اسے چارج کر کے ان لاک کرنے کی کوشش کی اور شروعات فرخ کے نام سے ہی کی اور حسن اتفاق سے وہ کھل گیا تو میں نے اُس کا جائزہ لیا اور تمام واقعات کی کڑیاں خود بخود جڑتی چلی گئیں۔ بھابی صاحبہ کا فرخ پر ناراض ہوکر اسے دھمکی دینا اور پیر پٹک کر غصے سے چل دینا، وغیرہ۔ تب میرے دماغ میں اچانک یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی فوری اطلاع ابرؤ کو دینا از حد ضروری ہے۔ سو چلا آیا۔ لیکن مجھے اس مجلس کا قطعی علم نہ تھا۔ پر اللہ کا احسان ہے کہ میں یہاں بروقت پہنچا ورنہ ایک بسا بسایا گھر خواہ مخواہ اُجڑ جاتا۔ شبانہ نے تشکر آمیز نگاہ سے مدار کو دیکھا اور رُندھی ہوئی آواز میں کہا مدار بھائی آپ نے وہ کارنامہ کر دکھایا جو شاید کسی سگے بھائی سے بھی نہ ہو سکے۔ ابرار نے جوش میں آ کر کہا کہ سائبر کرائم پولیس میں اس کے خلاف بلیک میلنگ اور سرٹیفکیٹ میں دھوکادھڑی کا کیس فائل کر دیتے ہیں۔ یہ سن کر قاضی سید عبدالکریم صاحب نے ناراضگی سے کہا کیا احمقانہ باتیں کر رہے ہو! اس سے آپ کو کیا حاصل ہوگا؟ بجز اس کے کہ پولیس، کورٹ، کچہری، وکیل، بدنامی کے ساتھ ساتھ وقت اور روپیہ کا بے تحاشہ زیاں، پھر ذہنی کوفت اور ملازمت سے وقت بے وقت غیر حاضری الگ گویا ایک لامتناہی عذاب جاں، اس لیے میرا پر خلوص مشورہ یہ ہے کہ اس معاملہ کو یہیں رفع دفع کر کے پرسکون زندگی گزاریں۔ یہ سن کر شبانہ ابرار کے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ ابرار نے بنک کی پاس بک اور مہر کے پانچ لاکھ روپیوں سے بھرا بیگ شبانہ کے ہاتھ میں تھما دیا تب جا کر ہچکیاں کچھ تھمنے لگیں۔

Mustafa Nadeem Khan Gauri

Zarrin Villa,B.11, Green Valley

Roza Bagh, Aurangabad - 431001 (M.S)

پروین طلحہ
مترجم: صبیحہ انور

پت جھڑ کی پتیاں

انجیلا پانچ سال کی ہے۔

انجیلا میری انگلی چھوڑ کر گرتی ہوئی پتی کے پیچھے بھاگی۔ وہ اس پتی کو زمین پر گرنے سے پہلے پکڑ لینا چاہتی تھی، لیکن پکڑ نہ سکی اور وہیں کھڑے ہو کر اس کا گرنا دیکھتی رہی۔ یہ پت جھڑ کا موسم تھا سوکھی زرد پتیوں پر کلوروفل کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ جس لمحے وہ پتی گری ہوا کا جھونکا آیا اور دوسری بہت سی پتیوں کے ساتھ اسے بھی سمیٹتا ہوا دور لے گیا۔ اور انجیلا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''مما جب یہ پتیاں زمین پر گرتی ہیں تو آواز کیوں نہیں ہوتی ہے۔ اتنی بہت سی پتیاں گرتی ہیں اور کہیں کوئی آواز نہیں۔ یہ پتیاں گرتے وقت شور کیوں نہیں کرتی ہیں۔ بتاؤ نہ مما۔'' ''شور کرتی ہیں بٹیا۔ لیکن پت جھڑ کی پتیوں کی گرتے وقت آواز نہیں ہوتی ہے۔''

''لیکن کیوں'' یوں تو انجیلا ایک خاموش بچی تھی مگر کچھ چیزوں کے لیے اس کے اندر عجیب سا تجسس تھا۔ اس کا تجسس پت جھڑ کی پتیوں کے بارے میں یہیں ختم نہیں ہوا تھا میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''پت جھڑ کے موسم میں درخت پتیوں کو کھانا دینا بند کر دیتے ہیں۔ جس سے پتے کمزور اور پیلے پڑ جاتے ہیں اور پھر ایک دن مر جاتے ہیں اور خاموشی سے نیچے گر جاتے ہیں۔'' ''شیطان درخت'' انجیلا کی آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں ''لیکن یہ سب پیڑ کو مارتی کیوں نہیں ہیں۔''

''کیونکہ پیڑ بہت بڑا ہے۔'' ''یہ چیختی چلاتی کیوں نہیں۔''

''یہ جانتی ہیں کہ درخت ان کی بات نہ سنے گا''

''تب تو اس گندے پیڑ کے لیے خدا سے شکایت کرنا چاہیے''۔

''میری بچی! وہ بھی مدد نہیں کرے گا۔''

''خدا بھی ان بے چاری پت جھڑ کی پتیوں کی مدد نہیں کرے گا!!'' انجیلا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور رنج سے آواز بھرا گئی۔

''بیٹے! جب تم اسکول جانے لگو گی تو تم کو کتابیں ملیں گی اور تمھاری ٹیچرس تم کو پیڑ پودوں، پھولوں اور پت جھڑ کے بارے میں سب بتائیں گی۔'' ''لیکن مجھے یہ کوئی نہیں بتائے گا کہ پت جھڑ کی پتیاں گرتے وقت شور کیوں نہیں کرتیں۔'' وہ اپنے ننھے منے پیر غصے سے پٹک رہی تھی۔

''لیکن تم کو پتہ چل جائے گا۔'' میں نے کہا اور غصے سے بھری انجیلا کو گود میں اٹھا کر گھر میں داخل ہو گئی۔

انجیلا آٹھ سال کی

دعا پڑھی گئی ہم کھانا شروع کرنے والے تھے انجیلا نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

''اچھا منی بیٹی کیا تم یہ جلیبی پڈنگ نہیں کھاؤ گی جو مما نے تمھارے لیے بنائی ہے۔'' میں نے کہا اور جلیبی پڈنگ کا ایک چمچہ اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔

''نہیں میں جلیبی پڈنگ نہیں کھاؤں گی، مجھے بتایئے کہ Calvary (وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا) کتنی دور ہے۔''

ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ضرور آج اسکول میں انجیلا کو کرائسٹ کے مصلوب ہونے کے واقعے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔

''بیٹی۔ کہاں سے کتنی دور تک؟'' البرٹ نے چاہا کہ معلوم کرے کہ اس وقت انجیلا کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ ''وہاں سے جہاں سے جیسس کو صلیب کو اپنے کاندھوں پر لے کر جانا پڑا تھا۔'' انجیلا نے کہا۔

وہ کیا پوچھ رہی تھی ہم اب بھی نہیں سمجھے تھے ہم لوگ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیا جائے کہ انجیلا مطمئن ہو جائے۔

''کیل وری وہ جگہ ہے جہاں پر ان لوگوں نے ہمارے جیسس کو صلیب پر میخوں میں جڑ دیا تھا اور ان کو اس وقت تک وہاں رکھا جب تک وہ ختم نہیں ہو گئے۔''

وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے، البرٹ اب تک نہیں سمجھا تھا۔

''یہ مجھے معلوم ہے ڈیڈی اور یہ بھی کہ وہ صلیب بہت وزنی تھی ان کو اس صلیب کو اپنے کمزور کاندھوں پر لے کر کیل وری تک جانا تھا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ جگہ کتنی دور تھی۔'' انجیلا تقریباً روہانسی ہو گئی تھی۔

''زیادہ دور نہیں تھی'' میں نے اس کو تسلی دینا چاہا۔

''لیکن کتنی دور تھی؟''

میں نے اس سے کہا کہ وہ اب سو جائے اور اس کو سو جانے کے لیے

انعام دینے کا وعدہ بھی کیا، میں عموماً اس کے سوالوں کے سامنے جب لاجواب ہوجاتی تو یہی کرتی تھی۔

انجیلا بائیس سال کی تھی۔

انجیلا عین ہماری امیدوں اور توقعات کے مطابق تھی۔ اس نے اپنی تعلیم پوری کرلی تھی اس نے بایوکیمسٹری میں فرسٹ ڈویژن لاکر پوری یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ اس کے لیے یونیورسٹی میں یا کسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اچھی نوکری ملنا یقینی تھا۔ یہ سال ہمارے لیے کئی معنوں میں بڑی خوش قسمتی لایا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں مجھے کئی اچھے ٹیوشن مل گئے تھے۔ انجیلا بھی دو ریئس لڑکیوں کو میوزک سکھا رہی تھی۔

جب سے مقامی اخبار سے البرٹ کی نوکری ختم ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں پیسہ کبھی کبھی ہی آتا اور وہ بھی بہت تھوڑا۔ مجھے تعجب ہوتا اگر گرمیوں کی چھٹی میں اس طرح مختلف طریقوں سے پیسہ نہ آتا تو ہم لوگ کیا کرتے۔ میری ماں اور بھائی کی فیملی آنے والی تھی جب وہ آزادی سے پہلے انگلینڈ گئے تھے اس کے بعد پہلی بار میرے گھر آنے والے تھے۔ گرمی کے اٹھارہ موسم گذر گئے تھے میرا دل اپنے چاہنے والوں اور عزیزوں کو دیکھنے کے لیے تڑپتا تھا۔ لیکن گھر کی ذمہ داریوں اور معاشی مسائل نے ہمیں ملنے نہ دیا تھا۔ ماں کے ساتھ ایک بار پھر وقت گذارنا میرے لیے بہت بڑی دلی مسرت تھی۔ اس سے زیادہ اپنے بھائی کے بیٹے کی چمکتی آنکھیں جو انجیلا کے اردگرد گھومتی رہتیں۔ اور جہاں وہ جاتی وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتیں۔ میرا گھر ان کی آوازوں اور ہنسی سے گونجتا رہتا۔ پہلی بار میں نے انجیلا کے رخساروں پر گلاب دیکھے تھے۔ اب سوال کرنے کی میری باری تھی میں انجیلا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ”تمھارے چہرے پر یہ گلاب کیوں کھلے ہیں۔“ جیسے بچپن میں مجھ سے وہ بہت سارے سوال کیا کرتی تھی، لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتی اس کے رخساروں کے گلاب خود ہی نہ صرف مرجھا گئے بلکہ بکھر گئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد دو مہینے تک خلاف معمول خاکی وردی والا ڈاکیہ پابندی سے انجیلا کے ہاتھ میں خط تھماتا رہا۔ پھر اس کا آنا بند ہوگیا۔ دو ماہ بعد ڈاکیہ پھر آیا۔ اس بار خط میرے نام تھا۔ میرے بھائی ڈک کا خط تھا۔ اس نے مجھ کو لکھا کہ میں انجیلا سے کہہ دوں کہ وہ ڈینزل کو خط نہ لکھے اس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ ڈینزل کی منگنی ایک اچھے انگلش خاندان کی لڑکی سے ہوگئی ہے۔ شادی ایسٹر سے پہلے ہوگی۔ میں نے انجیلا سے کچھ نہیں کہا۔ خط پیانو پر وہیں چھوڑ دیا۔ مجھے پتہ نہیں اس نے پڑھا بھی یا نہیں۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے رخساروں کے وہ گلاب نہیں کھلے جب اسے C.D.R.I. میں من چاہی نوکری ملی، نہ ہی جب اسے اس کی ریسرچ کے لیے نیشنل ایوارڈ ملا۔ وقت اسی طرح گذرتا رہا۔ اپنے سبجیکٹ پر ریسرچ کے لیے اسے بہت شہرت ملی جو ہمارے لیے فخر و مسرت کا سبب تھی۔ میرا دل چاہتا کہ کسی طرح میں ان تمام کامیابیوں کے بدلے میں کسی طرح گلابوں کو اپنی بچی کے رخساروں پر کھلتا ہوا دیکھوں۔

انجیلا اکتیس سال کی اور دہلی میں پہلا کرسمس۔

اسی درمیان انجیلا کو دہلی میں بہت اچھی نوکری مل گئی اور وہ لکھنؤ سے چلی گئی اور ہم لوگ لکھنؤ میں رہ گئے۔ ہم صرف کرسمس کے موقع پر دلی جاتے دلی میں کرسمس پر ہم نے انجیلا کو بالکل بدلا ہوا پایا وہ صحتمندی سے دمک رہی تھی اس کی خوشی اور مسرت اس کے سراپا سے جھلک رہی تھی۔ میں نے انجیلا کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا ان دنوں بھی نہیں جب گرمیوں کی مختصر سی چھٹیوں میں میرے رشتے دار انگلینڈ سے آئے تھے۔ انجیلا کی نوکری بہت اطمینان بخش تھی۔ اس کے افسران اس سے بہت خوش اور بہت مہربان تھے ساتھی بہت مددگار تھے۔ اس کا ایک ساتھی پہلے ہی دن ہم سے ملنے ہمارے گھر تازہ پھولوں کے گلدستے کے ساتھ آیا تھا، پھول اس نے میرے ہاتھ میں تھمائے اور کہا ”ویلکم۔ ممّا۔“

مجھے اعتراف ہے کہ اس کی گرم جوشی نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔

وہ عمر میں انجیلا کے برابر یا شاید کچھ بڑا ہوگا۔ بال ماتھے سے پیچھے کی طرف کم ہو رہے تھے ایک دوستانہ ہنسی اس کے چہرے پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے ناہموار بے ترتیب دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات تھی کہ ملنے والا ہنس پڑتا۔ جب کہ اس کی آنکھیں مسکراتی ہوئی رہتیں۔ مجھے فوراً اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ انجیلا کے لیے ایک دفتر کے ساتھی سے کچھ زیادہ تھا وہ بڑی تیزی کے ساتھ البرٹ اور اس کے تینوں بھائیوں کے مقابلے میں انجیلا پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔

یہ رشتہ ہر گذرتے ہوئے دن کے ساتھ مضبوط ہوتا نظر آ رہا تھا یا پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا، ایک دن میں نے انجیلا سے سنا کہ وہ ایک شادی شدہ آدمی ہے اور چند ماہ بعد باپ بننے والا ہے، دو ماہ پہلے انجیلا سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی بیوی ایک بہت اونچے باثر آدمی کی بیٹی تھی اس وقت وہ چار ماہ کی حاملہ تھی۔ اس خبر نے میرے احساسات کو جیسے مفلوج کر دیا۔

ناامیدی اور صدمے سے میں نے انجیلا کو اس کے شانوں سے پکڑ کر ہلا ڈالا۔ میں اسے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ پہاڑی کی جس چوٹی پر وہ کھڑی ہے اس کی ڈھلان سے گہری کھائی میں گرنے سے اسے بچالوں لیکن میں کچھ نہ کرسکی۔ انجیلا اپنی بڑی بڑی بنفشی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے یقین اور اعتماد جھلک رہا تھا۔

اس نے کہا ''مما وہ اپنی بیوی سے خوش نہیں ہے۔ اس نے طے کرلیا ہے کہ وہ اس کو طلاق دے دے گا۔'' انجیلا کا خیال تھا کہ ان باتوں سے میں بھی اسی طرح مطمئن ہو جاؤں گی جیسی کہ وہ ہوگئی تھی۔

میں دلی سے، بہت بے چین اور دکھے دل کے ساتھ لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئی۔

دلی میں دوسرا کرسمس

انجیلا کا اپارٹمنٹ انجیلا کی طرح خوشیوں سے بھرا تھا۔ انجیلا کے ساتھی نے اسی گرم جوشی سے اسی دوستانہ ہنسی اور تازہ پھولوں کے گلدستے کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ پورے مہینے جب تک ہم وہاں رہے۔ انجیلا کا فلیٹ خوشیوں اور موسیقی سے گونجتا رہا۔ لیکن جو خبر میں سننا چاہتی تھی وہ سنائی نہ دی اور وہ وقت بھی آ گیا جب ہمیں لکھنؤ واپس جانا تھا۔

دلی میں تیسرا کرسمس

سب کچھ ویسا ہی تھا وہی تازہ پھولوں کا گلدستہ وہی دوستانہ گرم جوشی۔ میں نے انجیلا سے بات کرنے کا موقع نکالا اور پوچھا۔

''ان وعدوں اور ان منصوبوں کا کیا ہوا''۔

''ابھی تک اسے اپنی بیوی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا ہے، کیونکہ اس کے بچے کی صحت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔'' مجھے انجیلا کی آنکھوں میں خوف کے سائے نظر آئے۔ ''جیسے ہی بچے کی طبیعت ٹھیک ہوگی وہ اپنی بیوی سے بات کرے گا۔''

انجیلا نے اپنے لہجے میں یقین لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے دل کی بے یقینی اور خوف چہرے سے عیاں تھا۔

دلی میں چوتھا کرسمس

کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی پھولوں کا گلدستہ اور پھولوں کے پیچھے ہنستی ہوئی اس کی آنکھیں بھی۔

''بات کچھ آگے بڑھی۔ میری بیٹی۔'' میں بے قراری اور عجلت کی ماری ماں انجیلا سے مخاطب تھی۔

''ممی اس کی بہن ابھی غیر شادی شدہ ہے اور وہ اس کی شادی سے پہلے کسی طرح کی قانونی کارروائی شروع نہیں کرنا چاہتا ہے۔''

مگر جلد ہی اس کی بہن کی شادی بھی ہوگئی، پانچواں کرسمس بھی آیا اور گذر گیا۔ اسی طرح چھٹا کرسمس بھی انجیلا کے لیے کچھ نہیں لایا بلکہ اس کے چہرے سے بچی کھچی رونق بھی لے گیا۔ اور اس بار جب میں اس سے ملی تو اس کی آنکھوں سے امید کا وہ آخری نشان بھی غائب ہو چکا تھا اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک واضح مایوسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

انجیلا 37 سال کی ہوگئی۔

''میری بچی تم کس بات کا انتظار کر رہی ہو۔''

''مما۔ کیل وری کا انتظار ہے۔'' انجیلا نے بہت نحیف لہجے میں جواب دیا۔ انجیلا کا اضطراب دیکھ کر میں بے قرار ہوگئی۔

''انجیلا میں تم اس کو اس طرح نہیں چھوڑوں گی تمھیں اس پر زور ڈالنا ہوگا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے۔'' ''ممی کمزور، طاقت والے پر زور نہیں ڈال سکتا ہے۔'' انجیلا نے تھوڑی سانس لی۔

''تم کو کون کمزور کرسکتا ہے؟ تمھارے ساتھ تمھارے کارنامے، تمھاری قابلیت، تمھاری کامیابیاں ہیں۔'' ''کامیابیوں، کارناموں اور صلاحیتوں سے کوئی طاقتور نہیں ہو جاتا۔ مما۔''

لیکن پھر اس طرح خاموش رہنے سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہے تم کو اس کے ماں باپ، بیوی اور بیوی کے اعلیٰ عہدے اور رسوخ والے باپ سے بات کرنا چاہیے۔ تمھارے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔ اگر لکھنؤ کے علاوہ کسی اور جگہ ہوتیں تو ایسے دھوکے باز انسان کو اس کی وعدہ خلافی کی سزا ضرور دیتیں۔ اس نے تمھاری تہذیب اور خاندانی شرافت کا غلط فائدہ اٹھایا ہے۔''

''ممی! شور مچانے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

''ارے بیٹے۔ پھر خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمھاری مدد کرے۔ میں بالکل مایوس تھی۔'' ''مجھے امید نہیں کہ خدا میری مدد کرے گا۔''

''کیوں خدا کیوں تمھاری مدد نہیں کرے گا۔ وہ ہمیشہ مدد کرتا ہے میری بیٹی۔'' ''لیکن ممی پت جھڑ آنے کے بعد نہیں۔''

امید اور خوشیوں سے محروم انجیلا کا چہرہ خزاں کی اس پتی کی طرح لگ رہا تھا جو شاخ سے گرنے والی ہو۔

''مگر میری بچی۔۔۔'' میں نے انجیلا کو قائل کرنا چاہا۔ انجیلا نے مجھے بیچ میں ہی روک دیا۔

''پیاری ممی! میں نے آپ کے تمام سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''میں اپنی صلیب بہت دور سے کاندھے پر اٹھائے ہوئے چل رہی ہوں۔ کوئی مجھے نہیں بتاتا کہ میری Calvary اب کتنی دور ہے۔''

انجیلا نے اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیس سال کی مہلت دی تھی لیکن میرے پاس آج بھی اس کا جواب نہیں ہے۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ انجیلا نے جو صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھی ہے وہ بہت وزنی ہے اور اس طویل راستے کو طے کرنے کا کوئی مختصر راستہ نہیں ہوتا ہے۔

(ماخوذ 'فدائے لکھنؤ'، قومی اردو کونسل)

کہانیاں

ٹوٹ گیا اِک تارا

تسنیم سلیم چھتاری

سائنس کا گھنٹہ تھا اور اسٹرانومی پڑھائی جا رہی تھی، ایک لڑکے نے پروفیسر سے پوچھا 'تارے کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟' پروفیسر صاحب اس وقت لیکچر میں گم تھے۔ انھوں نے اس سوال پر دھیان نہیں دیا۔

اسی لڑکے نے پھر یہی سوال کیا اور پروفیسر صاحب نے دوبارہ بھی نہیں سنا تو میرے قریب سے ایک دوسرے لڑکے نے آہستہ سے کہا۔

'مجھ سے پوچھو...... جب کسی کی موت آتی ہے تو تارہ ٹوٹتا ہے'

'جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارہ ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے' اس فقرے سے سب کے کان آشنا تھے۔ یہ بات لاکھ مرتبہ چمکتے تارے کی طرح دل کے آسمان پر طلوع ہوئی تھی اور تکلیف کی اندھیری گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔

مجھے اس جواب نے وہ ساری کہانی یاد دلا دی جس میں ایک تارہ نکلا چمکا اور پھر اپنے پیچھے یاد کی گہری لکیر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔

پانچ برس پہلے کی بات! مگر کیا پچاس برس کے بعد بھی میں انجم کو بھول سکوں گا! نہیں! مگر کاش! ان دنوں میں آٹھویں کلاس میں تھا شور و شغب کا عادی اور شرارت پسند! دنیا بھر کے کھیلوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور صبح سے شام تک نت نئی حرکتیں کیا کرتا...... روز کپڑے پھٹتے گھٹنے اور کہنیاں لہولہان رہتیں! اماں ابا کی ڈانٹ بھی پڑتی اور چوٹوں کی تکلیف بھی ہوتی پر اس دکھ میں، کیسا خوشی کا پہلو تھا۔ میں پھٹے ہوئے کپڑے اور مجروح جسم لے کر انجم کے پاس پہنچتا۔

'انجم خدا کے لیے...... دیکھیے آج اماں سے ضرور پٹ جاؤں گا۔'

'کیا ہو گیا'؟ وہ پوچھتیں

'دیکھیے کیسی خراش لگی ہے......اور یہ قمیص کی آستین مونڈھے پر سے الگ......اور کوٹ کا بٹن ندارد......اُف کتنا خون نکلا ہے'۔

'شریر' ایک ہلکا سا تھپڑ میرے بے ترتیب بالوں پر پھسلتا۔ 'چلو اب خالہ کو دکھا کر لاؤں......لاڈلے کے ڈھنگ'۔

'ارے ارے......کیا جوتیاں کھلوائیے گا......قسم آپ کی چھپ کر آیا ہوں اب یہاں منہ ہاتھ دھو کر جاؤں گا......اگر انھوں نے دیکھ لیا اس شان میں تو آپ سمجھ لیجیے کیا ہوگا'۔

'اچھا ہے مجھے تو خوشی ہوگی تم مہینے میں چار چھ جوڑے تو چیتھڑے کر لیتے ہو! اور یہ جو روز مرہ پٹخنیں لگتی ہیں...... مجھے تو اس کا ڈر ہے کسی دن ایک آدھ ہڈی نہ چٹخ جائے......'

'میرا کیا بگڑے گا......آپ ہی تیمارداری کیجیے گا'۔

'ہاں جیسے تمھاری نوکر ہوں نا!'

پھر سچ مچ وہ نوکروں کی طرح سے ہاتھ منہ دھلواتیں کپڑے سیتیں زخموں پر ان کے پرانے دوپٹوں کی پٹیاں بندھتیں جب میں درست ہو کر چلنے لگتا تو وہ ہنس کر کہتیں 'پرویز میں کہے دیتی ہوں اگر اب تم نے......' میں ہنستا ہوا بھاگ آتا اور دوسرے دن پھر اسی حالت میں پہنچتا!

انجم مجھ سے کئی سال بڑی تھیں۔ پھر کوئی رشتہ ناطہ بھی نہیں...... میں اپنی شرمیلی طبیعت کے باوجود ان سے کچھ اس طرح گھل گیا تھا۔ جیسے چھوٹے بڑے اور اپنے پرائے کا فرق ہی باقی نہ رہا ہو۔ اپنی دلچسپی کی ساری باتیں ان کو سناتا اور ان کی ساری باتیں بڑے شوق سے سنتا......اور کبھی سوچنے لگتا کہ مجھے کشیدہ کاری اور کھانا پکانے کی ترکیبوں سے کیا

تعلق!......انجم کو ہاکی اور فٹ بال سے کیا واسطہ! مگر یہ نہیں کہ ہم باتیں کرتے اکتاتے ہوں.....ایک کہہ رہا ہے دوسرا محویت سے سن رہا ہے کچھ ایسی باتیں کہ تیسرا آبیٹھے تو حشر تک نہ سمجھے کہ آخر گفتگو کا موضوع کیا ہے۔

ایک سال میں کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی جب شروع میں ہم ان کے یہاں کرایہ دار ہو کر آئے تو مجھے سخت کوفت ہوئی کہ یہ ایک عدد لمبی تڑنگی لڑکی یہاں موجود ہے ان دنوں میں لڑکیوں سے بیحد گھبراتا تھا۔ آج بھی اسی قدر! مگر انجم کو شاید اشرف المخلوقات سے بھی کچھ بڑھ کر پایا اور وہ بہت جلد میرے خیالات اور احساسات کی شریک بن گئیں۔

دنیا میں کتنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں مجھ میں لاکھوں باتیں نئی پیدا ہوئیں اور پرانی علاحدہ ہو گئیں۔ نئے کھیل سیکھے نئے دوست بنائے نئی باتیں سوچیں اور نئی باتیں سنیں......آنکھوں میں بھی شاید نئے نئے رنگ تیرتے تھے۔ جب ہی تو جدھر نگاہ اٹھتی ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی مگر انجم! کیا اس ایک سال نے رتی بھر فرق بھی پیدا کیا تھا! نہیں وہی لبوں کی خفیف سی لرزش پر دھیمی مسکراہٹ کا رقص! وہی ہلکے سے تھرتھراتی ہوئی پلکوں کے درمیان سے دو تاروں کی شعاعیں وہی سیاہ بالوں میں ڈوبتی ابھرتی لہریں......وہی ہاتھوں کی نرمی اور وہی آواز کا رس! وہ کہیں سے ذرہ برابر تھیں بدلیں اور میں اس یک رنگی سے کتنا مانوس ہو گیا تھا......کبھی کبھی سوچتا کہ اگر انجم اپنے مخصوص انداز کے بجائے ذرا اکڑ کر چلنا شروع کر دیں خوابیدہ سی آنکھوں کی بجائے اور لڑکیوں کی طرح دیدے پھاڑ کر بات کرنے لگیں تو کیسی عجیب لگیں گی! تجربہ! اور مجھے خیال آتا وہ ہلکے ہلکے رنگوں کی بجائے گہرے رنگ کے کپڑے پہننا شروع کر دیں یا شلوار قمیص کی بجائے ساڑھی باندھنے لگیں تو کیا میں انھیں بیک نظر پہچان لوں گا! اور کیا تب بھی ان کے چہرے پر یہی دلکشی ہوگی......شاید نہیں۔

ان کی باتیں کیسی اچھی اور کتنی مخصوص تھیں!

میں سونے کے معاملے میں بہت ماہر تھا مگر جب سے انھوں نے بتایا کہ وہ روز صبح کو باغ میں پھول چننے جاتی ہیں اور دیر تک وہاں ٹہلتی ہیں تو آپ سے آپ میری آنکھ صبح سویرے کھل جاتی اور میں سلیپر گھسیٹتا ہوا باغ میں پہنچتا وہ حوض کے کنارے ٹوکری لیے مجھے اپنی منتظر ملتیں......سفید شلوار کے شبنم سے بھیگے ہوئے پائنچے......کسی ہلکے رنگ کے باریک سے دوپٹہ میں شگفتہ چہرے جیسے اوس میں بھیگا ہوا گلاب! اور ایک مخصوص فقرہ!

'کہو......کیا حال چال ہے؟'

'رات بھر گھٹنے میں درد رہا......جائیے آپ نے کیا منحوس دوا لگائی تھی'

'لو اب مجھے الزام دیتے ہو......شریر......اچھا اب میں پھول جمع کرتی ہوں......شرط یہ ہے کہ تم کسی پھول کو ہاتھ نہ لگانا۔'

'واہ یہ کیا پابندی ہے' میں جل جاتا۔

'بھائی پرویز تم مرد ہو......سنا ہے کہ مردوں کے ہاتھ بہت سخت ہوتے ہیں......پھول مرجھا جاتا ہے۔'

میں اس دلیل کو روز مان لیتا اور چپ چاپ بیٹھا انھیں تکتا رہتا۔ وہ پھول توڑ کر واپس جانے لگتیں تو میں ان سے ایک پھول مانگ لیتا۔

'میرا حصہ لائیے۔'

وہ کوئی اچھا سا پھول لے کر میرے نائٹ ڈریس کے کوٹ میں اٹکا دیتیں میں واپس آ کر کپڑے بدلتا اور ناشتہ کر کے اسکول چلا جاتا......دن بھر دماغ میں میٹھی میٹھی سوچ کی بارش ہوتی رہتی اور جب شام کو کھیل سے واپسی پر سیدھا ان کے یہاں پہنچتا تو وہ پرانے دوپٹوں کی پٹیاں بنائے اور مختلف اقسام کے مرہم لیے میری راہ تک رہی ہوتیں!

زندگی کا یہ وہ دور بھی کتنا مطمئن اور پرسکون تھا مجھے ہر صبح شام کا انتظار رہتا کہ اپنا زخم خوردہ جسم ان کی تیمارداری کے سپرد کر دوں اور شام گذرنے پر صبح کا رستہ تکتا کہ ان سے باغ میں جا کر ملوں! اسی چکر میں دن بھاگتے چلے گئے!

رفتہ رفتہ میری یہ کیفیت ہو گئی کہ نہ کسی دوست سے دوستی اور نہ کسی کھیل سے دلچسپی! ہر دم یہی خواہش کہ بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہوں خود بخود یہ بھی خیال آتا کہ وہ مجھ سے گھبرا نہ جائیں یہ نہ پوچھیں کہ بلا ضرورت کیوں آئے ہو......میں وہاں جانے کو لاکھوں بہانے ڈھونڈتا ایسا بھی ہوا کہ دانستہ ٹھوکر کھائی اور چوٹ مار لی جان بوجھ کر کپڑے پھاڑے اور پہنچ گیا۔ یہ بھی نہیں تو جا کر منہ بسورنے لگا۔

'خیر تو ہے کیا ہوا؟'

'بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔'

'کیوں دوپہر کھانا نہیں ملا تھا؟'

'وہ سب ہضم ہو گیا'

'تو پھر' گہری مسکراہٹ سے آنکھوں کی لو بھڑک اٹھتی

'کچھ کھلائیے جلدی......'

'ایک شرط پر'

'کہیے'

'مجھے بازار سے اس رنگ کا اُون لا دو گے؟' وہ نمونہ دکھلاتیں۔

'ایک شرط پر!' مجھے بھی شرارت سوجھتی۔

'وہ کیا؟'

'اگر آپ اُن کے پیسے دیں!'

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہتے۔ مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلاتیں اور میں بازار سے اون لے آتا!

پھر ایک ایسا احساس جو میرے لیے عجیب بھی تھا اور پریشان کن بھی! میں نے محسوس کیا کہ جب وہ میرے علاوہ کسی اور سے باتیں کرتی ہیں تو مجھے ناگوار ہوتا ہے وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی ہیں تو میرا جی الجھتا ہے ان سے کوئی ملنے آتا ہے۔ تو مجھے برا لگتا ہے...... خدا جانے کیوں کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں ان کے یہاں پہنچا تو اور دو چار لڑکیوں کو بیٹھے پایا میں لوٹنے لگتا تو انجم مجھے روک لیتیں!

'ارے بھئی پرویز کہاں بھاگ رہے ہو۔'

میں ٹھہر جاتا تو...... 'یہ تمھارے پسندیدہ نکونے ہیں! کھاؤ نا منہ کیا تک رہے ہو...... ارے بھئی ایسی بھی کیا شرم۔'

ایسے میں ان کی میٹھی میٹھی باتیں بھی کڑوی لگتیں...... سب تو جمع ہیں اور میں تماشہ بنا بیٹھا رہوں یہ کیا زبردستی ہے...... اٹھنے لگوں گا تو روکا جاؤں گا اور رُک جاؤں گا تو مجھ سے بے فکر ہو کر ادھر ادھر باتوں میں لگ جائیں گی! مجھے بھی اتنا غصہ آتا کہ بیان سے باہر...... مگر ان سے احتراز تو ناممکن تھا...... ایک نامعلوم سی کشش!

اور وہاں مجھے ایک دکھ بھی تھا میں انھیں اپنا ساتھی اپنا دوست اپنا رفیق اپنا ہمراز سب کچھ سمجھتا...... اور وہ مجھے ایک کمسن اور نادان بچہ! وہ مجھ سے عمر میں یقیناً بہت بڑی تھیں پانچ یا چھ سال! مگر میں ناسمجھ اور نادان بچہ نہیں میں محبت اور نفرت کو سمجھتا ہوں مجھے آنسو اور ہنسی کی حقیقت معلوم ہے...... بے تکلفی اور محبت کے علاوہ مجھے ان کے سلوک میں ایک طرح کا بزرگانہ اور ناصحانہ انداز دکھائی دیتا اور میں جھنجھلا سا جاتا...... یا تو وہ مجھے اپنے برابر کا سمجھیں۔ میری نگاہوں میں کچھ دیکھیں میری باتوں میں کچھ پائیں...... اور میری کمسنی کا ان کو اسی قدر احساس ہے تو مجھے صحیح معنوں میں بچہ سمجھ لیں...... مجھے دیکھ کر لیٹے سے بیٹھ جاتی ہیں۔ پھسلا ہوا دوپٹہ گلے میں آلپیٹتا ہے...... اور مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے تو وہ کسی نہ کسی بات پر کہہ اٹھتی ہیں 'تم نہیں سمجھتے پرویز تم ابھی بچے ہو...... اُفوہ بچپن سے عطر لگانے کا شوق!'

میں چکرا جاتا...... مگر خاموش!

پھر ایک دن......

'انجم انجم کہاں ہیں آپ؟'

'یہ رہی' وہ ہمیشہ کی طرح ایک آدھ بنے سوئیٹر سے الجھ رہی تھیں۔

'آج تو ایسی بھوک لگی ہے کہ زندگی میں نہ لگی ہوگی۔'

'ارے تب تو کسی ثقیل غذا کی ضرورت ہے!'

'ہاں بس جلدی کیجیے۔'

'بلا معاوضہ کے نہیں!'

'کیا چاہیے؟' میں نے شان کے ساتھ کہا۔

'دیکھو پرویز یہ میں اپنی ایک سہیلی کا سوئیٹر بن رہی ہوں اور بدقسمتی سے اس میں ایک لچھی اون کم پڑے گا۔'

'میں تو نہیں لاؤں گا۔' سہیلی کے ذکر سے میں چڑ گیا۔

'کیوں بھئی یہ خفگی کیسی؟'

'جب دیکھو آپ سہیلیوں کے سوئیٹر بنتی ہیں...... کبھی ہم کو بھی کچھ بن کر دیا...... میں تو اب ہرگز ہی اُون لا کر نہ دوں گا۔'

'اچھا یہ بات ہے...... ایمان سے کہنا کبھی تم نے فرمائش بھی کی!'

'میں کیوں فرمائش کرتا جب آپ کو خود ہی خیال نہ آیا'

'میں چاہتی تھی کہ تم اپنے منہ سے کہو۔'

'میرا دل تھا کہ جب آپ کو اپنی طرف سے رحم آجائے۔'

وہ ہنسنے لگیں اور پھر بولیں 'مجھے یہ بات تسلیم ہے مگر دیکھو پرویز اگر تم نے اس کا شکوہ کیا تو یہ ہم دونوں کے لیے خوشی کی بات نہیں!'

ان کا یہ سوال! کہنے کا انداز!! اور اپنی مسرت کی انتہا مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ایک ہفتہ بعد جو گیا تو انھوں نے سفید رنگ کا بیحد خوبصورت اور نرم سوئیٹر مجھے پہنا دیا۔

'بولو پسند ہے؟'

'سوئیٹر تو پسند ہے مگر آپ کا یہ سوال کرنے کا انداز پسند نہیں آیا۔'

'کیوں؟'

'آپ کا خیال تھا کہ میں اسے ناپسند بھی کرسکتا ہوں؟'

جب اپنی طرف لوٹا تو زمین پر قدم نہیں پڑتے تھے اور آپ سے آپ ہنسنے کو دل چاہتا تھا۔

اماں نے دیکھ کر کہا۔ 'ارے یہ نیا سوئیٹر!؟'

میں نے کہا۔ 'جی ہاں انجم نے بن کر دیا ہے۔'

وہ کہنے لگیں 'انجم بہت محبت کرتی ہے تجھ سے...... اگر تیری عمر کی ہوتی تو ہم شادی کر دیتے!'

اماں نے یہ فقرہ یونہی سرسری طور پر ازراہ مذاق کہا تھا۔ مگر میں اس

حد تک حواس باختہ ہوا کہ دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

'انجم کی شادی اور میرے ساتھ...... کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے مگر نہیں!! میں ایسا خواب بھی دیکھوں تو پھر آنکھ کھولنے کی نوبت نہ آئے! میں انجم سے محبت کرتا ہوں ان کا احترام کرتا ہوں! وہ کہیں تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں مگر شادی!! ان کی تو محض پرستش کی جاسکتی ہے...... اگر کہیں یہ ممکنات سے ہوتا تو بھی میں اس کے لیے تیار نہ ہوتا...... میری نگاہ میں تو یہ ان کی توہین ہے...... اور وہ اگر سنیں تو شاید پھر مجھ سے بات بھی نہ کریں...... مجھے تو وہ بچہ سمجھتی ہیں...... چھوٹا سا بچہ جو چوٹ کھا کر بسورتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاتا ہے...... جو بھوک کی حالت میں ان کے پاس جاتا ہے اور کچھ کھا کر مطمئن ہو جاتا ہے...... کمسن بچہ جسے ابھی سگرٹ نہیں پینا چاہیے۔ عطر نہیں لگانا چاہیے...... اور شاید وہ یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اس دودھ پیتے بچے کو ان سے محبت کرنے کا حق تک حاصل نہیں ہے...... اسی لیے انھوں نے میری حالت کو قابل غور نہیں سمجھا اور مجھے ان سے اُن لاکھ باتوں میں سے ایک بھی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی جو میں دن رات سوچا کرتا تھا...... میں انھیں ہر دم دیکھنا بات کرنا پاس بیٹھنا ضرور چاہتا ہوں مگر شادی! اگر اس کی کوئی صورت ہوتی تو کیا میں اسے برداشت کر لیتا...... میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں تا حیات ان کو باغ کے پھول چنتا ہوا دیکھتا رہوں ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہوں! وہ سر جھکائے میرے ہاتھ پیروں کی چوٹوں کا معالجہ کرتی رہیں اور میں ٹکٹکی باندھے ان کے بالوں میں گھونگر کی لہریں تکتا رہوں۔ وہ بڑے انہماک سے میرے لیے تکو نے تلتی رہیں اور میں پاس بیٹھا ان کے رخساروں پر جھکی ہوئی لمبی لمبی پلکوں کا سایہ تھرکتا ہوا دیکھتا رہوں...... ایسی ہی ایک موہوم سی لرزش جیسے ان کے سامنے پہنچ کر میرے پیر ڈگمگا جاتے ہیں۔

میں جاؤں تو وہ مسکرا کر پوچھیں 'ہاں تو کیا حال چال ہے؟' میں واپس آنے لگوں تو ہنس کر کہیں 'پرویز میں کہے دیتی ہوں...... 'شادی تو ان کی جلد ہی کسی نہ کسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ جو ان سے عمر میں دو چار سال بڑا ہوگا کہیں نوکر ہوگا...... اور پھر جسے وہ پسند کریں گی!؟

مجھے خیال آیا کہ اگر ان کی شادی ہوگئی تو وہ یہاں سے چلی جائیں گی اور میری زندگی کا سہانا خواب بکھر کے رہ جائے گا۔ دل کو زبردست دھکا لگا...... کیا اب میں ان سے جدا رہ کر بھی خوش رہ سکتا ہوں...... وہ میری زندگی کا ایک جزو بن چکی ہیں ان کی مسکراہٹ اُن کی باتیں ان کی گہری گہری آنکھیں...... اور میں گہری گھاٹیوں میں ڈوب گیا......"

اماں نے کہا 'کل جاوید آ رہا ہے؟

میری محویت کا تسلسل ٹوٹ گیا...... چلو اچھا ہے بھائی جان آ رہے ہیں ڈیڑھ سال بعد ان سے ملاقات ہوگی۔ دیکھیں اب بھی پہلے کی طرح سے شعر و افسانہ پسند ہیں یا نوکری نے کچھ تبدیل کر دیا۔!

ادھر بھائی جان بی۔ اے کر کے نوکر ہوئے ادھر ابا جان کا تبادلہ ہوا اور ہم یہاں آ گئے۔ اماں بیچ میں ایک مہینہ کے لیے ان کے پاس ہو آتی تھیں اور ابا جان بھی اکثر دورے کے سلسلے میں ان سے مل لیتے بس میں نے ہی ڈیڑھ سال سے نہ دیکھا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ابا جان کو بھائی جان نے لکھا بھی تھا کہ پرویز کو یہاں بھیج دیجیے میں نیم راضی ہو چلا تھا۔ جو انجم نے کہا کہ 'تم ناحق جا رہے ہو گول کر جاؤ' میں نے جھٹ سے آ کر اماں جان سے انکار کر دیا کہ میں نہ جاؤں گا۔ اب بھائی جان کو ایک مہینہ کی چھٹی ملی تو وہ یہاں خود ہی آ رہے تھے۔

میں بھائی جان کو لینے اسٹیشن گیا وہ حسب توقع خوب صاحب بہادر بنے ہوئے تھے۔ کہنے لگے 'کیسی جگہ ہے؟ ایک مہینہ خوب شاندار گزرے گا یا نہیں؟'

میں نے کہا 'اب جیسی بھی جگہ ہے آپ خود ہی دیکھ لیجیے گا۔'

'یوں نہیں ٹھیک بتاؤ'

'کیا بتاؤں؟'

'یہی کہ سوسائٹی کیسی ہے؟...... سینما ہاؤس کیسے ہیں کلب کتنے ہیں۔ اور ہوٹل کہاں کہاں ہیں؟...... تفریح کا کیا پروگرام رہتا ہے۔'

میں نے کہا۔

میں نے کہا۔ 'مجھے ہوٹل اور کلب کی تو خود بھی خبر نہیں! سوسائٹی اچھی خاصی ہے دو چار سینما ہاؤس بھی ہیں'

'انگلش فلم چلتی ہیں؟'

'کبھی کبھی......'

'لاحول ولا قوۃ۔'

'کیوں؟'

'وقت ضائع ہوگا یہاں اور کیا...... آخر تم چھٹیوں میں میرے پاس کیوں نہ آ گئے...... کیا کرتے رہتے ہو دن بھر؟ اسکول اور گھر؟ بس؟'

'ہاں بس اور کیا۔'

'دل نہیں گھبراتا؟ صحت ٹھیک ہے!'

'کمال کرتے ہیں آپ بھائی جان......'

بھئی کم از کم میں تو اس طرح نہیں رہ سکتا...... سوچتا ہوں کہ مہینہ بھر کے بجائے دس پندرہ دن میں بھاگ جاؤں...... تم بھی میرے ساتھ

چلنا! سمجھے؟ وہیں اسکول میں داخل ہو جانا...... انسان بن جاؤ گے! سمجھے؟'

اسٹیشن سے گھر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔

اماں سے ملنے کے بعد انھوں نے مجھ سے سوالات کرنے شروع کیے!

'یہ کس کا بنگلہ ہے؟ وہ کس کی کوٹھی ہے؟ ادھر کون رہتا ہے؟'

میں سب بتاتا رہا۔

'اور یہ برابر کا گھر............؟'

'انجم!'

'کون انجم؟ یہ کون صاحب ہیں؟'

اور مجھے محسوس ہوا کہ میں نے انتہائی مہمل قسم کا جواب دیا تھا۔

'ایک وکیل صاحب ہیں وہ مع فیملی رہتے ہیں۔'

'وکیل صاحب کا نام زوردار ہے! انجم' بھائی جان نے زیرلب کہا میں گھبرا گیا 'وکیل صاحب کا نہیں انجم تو ان کی لڑکی کا نام ہے۔'

'اوہ' بھائی جان نے مجھے سرتاپا گھورا۔ 'تو کیا بہت دوستی ہے تم سے؟'

'دوستی کیا...... بس' میں ٹپٹا گیا۔

'خوب! گویا کہ آپ بھی!؟' انھوں نے معنی خیز طریقے پر ہنسنا شروع کیا۔

'تو پھر تفصیل بتاؤ کیسی لڑکی ہے؟'

'اچھی خاصی ہیں...... آپ کی برابر ہوں گی' میں نے ان کا شبہ مٹانا چاہا۔

'میری برابر؟ وہ! یوں کہو! میں تو سمجھا تھا کہ آپ!..........'

میں سوچنے لگا کہ جو بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں اسے بھائی جان یوں لمحوں میں کیسے سمجھے لے رہے تھے!

بھائی جان کرسی پر لیٹ کر کوئی انگریزی کا ناول پڑھنے لگے اور میں نے سوچا کہ دیر تو ہو گئی ہے مگر لاؤ انجم کے یہاں ہو آؤں...... ان کو بتاؤں گا کہ ہمارے بھائی جان آئے ہیں...... دفعتاً مجھے دروازے پر ان کی آواز سنائی دی۔ 'پرویز'

میں نے چونک کر کہا 'جی'

'کیا ہوا آج تم............' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئیں۔ بھائی جان بھی سر اٹھا کر گھورنے لگے۔

'یہ میرے بھائی جان ہیں۔' میں نے تعارف کی رسم ضروری سمجھی

'اور بھائی جان یہ انجم ہیں...... میں نے آپ کو بتایا تھا نا!'

بھائی جان نے مسکرا کر ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا

"Please to meet you"

انھوں نے عمداً بھائی جان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا اور کھڑکی سے باہر نگاہ جما کر بولیں 'متعارف کیجیے مجھے انگریزی نہیں آتی۔'

'اوہ' بھائی جان نے سنبھل کر کہا 'کوئی حرج نہیں مجھے تو اردو آتی ہے۔'

'اچھا تو میں چلتی ہوں۔' وہ مڑ کر جانے لگیں۔

'انجم ذرا تو بیٹھیے نا۔' میں نے سوچا کہ اب بھائی جان ان کو بد اخلاق اور پتہ نہیں کیا کیا کہیں گے اور میرا جی جلے گا۔

'جی ہاں آپ تشریف لائی ہیں تو بیٹھیے نا۔' بھائی جان نے بھی کہا۔

'بہت کام ہے...... آج پرویز نہیں آئے تو میں سمجھی کہ نہ جانے کیا بات ہوئی.......... اچھا آداب عرض'۔ اور وہ چلی گئیں۔

میں نے سہمی سہمی نظروں سے بھائی جان کی طرف دیکھا کہ کیا کہتے ہیں مگر وہ کسی سوچ میں گم تھے۔

دوسرے دن اسکول کی واپسی پر میں نے سوچا کہ اب ان کے یہاں چلنا چاہیے...... اور اٹھا ہی تھا جو بھائی جان نے کہا۔

'کہاں چلے؟'

'کہیں نہیں۔'

'انجم کے یہاں نہیں جاؤ گے؟'

'سوچ رہا ہوں'

'چلو! ہم بھی چلتے ہیں' وہ اٹھ کر میرے ساتھ چل دیے...... میرا دل چاہا کہ کاش وہ میرے ساتھ نہ جاتے میں انجم سے اچھی طرح بات بھی نہ کر سکوں گا اور کل کی سی وحشت پھیلے گی۔

وہاں پہنچے تو انجم کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی انھوں نے بھائی جان کو بہت پیار کیا دعائیں دیں وکیل صاحب آ گئے، چائے کا دور چلتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا انجم کو دیکھتا رہا جو آج بالکل مہر بہ لب تھیں تھوڑی دیر بعد ہم لوٹ آئے۔ بھائی جان دیر تک اماں سے وکیل صاحب کی تعریف کرتے رہے۔

تیسرے روز میں اسکول کی واپسی پر اپنے معمول کے مطابق سیدھا انجم کے یہاں پہنچا۔ اول گھر جانے میں خطرہ تھا کہ پھر بھائی جان ساتھ چلیں گے۔ اور انجم سے بات چیت نہ ہو سکے گی۔ میں انھیں یہ بتانے کے لیے مضطرب تھا کہ اس دفعہ مجھے کرکٹ میں کپ ملنے کی امید ہے۔ پہنچا تو دیکھا کہ صوفے پر لیٹی ہوئی آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہیں۔ میں چپ چاپ جا کر پیچھے کھڑا ہو گیا اور بصد مشکل یہ شعر سمجھ سکا۔

(بقیہ آئندہ)

ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید

خوف کے موسم میں لکھی گئی

انسانوں سے ڈر لگتا ہے
جنگل کے خونخوار درندے
ایک وار میں جسم بے جان کر دیتے ہیں
صرف جب
کوئی ان کے بچوں پر شکاری نظر ڈالے
مگر انسان
میرے معبود میرے پرمیشور کی بنائی مخلوق
اشرف المخلوقات
گھنونی ہوس کے پتلے
میری ادھ مری معصوم بچی سے
اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں
آصفہ
تیری شربت سے بھرپور آنکھ بن گئی
پہلے آنسو پھر پتھر
بچھے ہوئے تیرے ریشمی بال
راکشش جبڑوں سے بچے ہوئے دار
تیرے شبنم ہونٹ...... پتھر سے چور تیری صراحی دار گردن......
ملک کے محافظ مندروں کے پجاری سرکاری کارندے

پے در پے
چیرتے پھاڑتے نگلتے رہے تیری معصومیت کو
جنگل کے خونخوار درندے

قطار در قطار
خاموش سر جھکائے رہے
اور کالے کوٹ پہنے انسان
اقتدار کی کٹھ پتلیاں
انسانیت کو سر بازار ننگا کرتے رہے

آصفہ

بھیڑیں چراتی چراتی کہاں کھو گئیں
کس جنگل جا بس گئیں میری چھوٹی
تم پہ منت کا دم پڑھ کے پھونکا
اور باندھا
کلائی پہ ڈورا سر پہ رومال
پھر دیا تم کو اس کی اماں میں
جو ہے سب کا حافظ محافظ
اور تم
چھلاوے کی مانند پیڑوں میں گم ہو گئیں
جنگلی چرندے پرندے تمھارے ہمجولی
وہ بھیڑوں سے بھرنا وہ چوکڑی بھرنا
سب تمھارے رکھوالے سب تمھارے نگہباں
مگر
وہ کون تھے؟
جو شہروں سے آئے جو کوسوں سے آئے
ناچتے رقص عفریت کا
ہوس کے پجاری لڑکیوں کے بیوپاری
وہ بدحال و تشنہ
وہ جسموں کے بھوکے لگے نوچنے
تیرے خون میں لتھڑے سراپا کو
کاٹتے بانٹتے
دہکاتے اپنی غلاظت
مندر کی دہلیز پر
اور ہمیشہ کے لیے
قتل اور ہوس کی مہر ثبت کر دی
مقدس دیواستھان پر

Syeda Saiyidain Hameed
267A, Sayyadain Manzil,
Jamia Nagar, Okhla
New Delhii-110025

مسعودہ نکہت

غزل

پردے، پردے میں بات اُس کی تھی
دل میں پوشیدہ ذات اُس کی تھی

تم نے دنیا کا ذکر چھیڑ دیا
میرے ہونٹوں پہ بات اس کی تھی

وہ گیا تو اندھیرا چھوڑ گیا
روشنی جیسی ذات اس کی تھی

صبح سے چھلکی چھلکی ہیں آنکھیں
گفتگو، پچھلی رات اُس کی تھی

بے نیازی شعار تھا جس کا
کائنات و حیات اُس کی تھی

نوحے لکھنا ہے عمر بھر نکہت
زندگی بے ثبات اُس کی تھی

Masooda Nikhat
57, Ato Ji Lane, Budhwara
Bhopal-462001-(M.P)

نجمہ عزیز مرادآبادی

غزل

جب جب میں آئینہ دیکھوں
سامنے ان کا چہرہ دیکھوں

وہ آئے ہیں میرے گھر میں
کب تک اُلٹا سپنا دیکھوں؟

ہے ان کا اعجاز محبت!!
بھیڑ میں خود کو تنہا دیکھوں

دنیا بھر کے رنج و غم کو
اپنے غم کا حصہ دیکھوں

امن کے دعوے داروں کو بھی
جنگ پہ اب آمادہ دیکھوں

ظلم و تشدد عدم تحفظ!
دورِ حوادث کیا کیا دیکھوں؟

Najma Azeez Muradabadi
Mohalla Qaziyan
Basti Kiratpur-246731 (U.P)

شہناز نبی

نظمیں

ہم پتھر نہیں

جب وہ اپنے گھروں سے نکلے
ان کے سروں پہ کفن بندھا تھا
دلوں میں جوش
آنکھوں میں بے خوفی
قبیلے کی بزرگ ترین ہستی نے پکارنا چاہا
اپنی تلواریں لیتے جاؤ
لیکن ان کے پتھر ہونے کا ڈر تھا
جب وہ اپنی بستیوں سے نکلے
ان کے سینوں میں دبی ہوئی آہیں تھیں
ہونٹوں پہ لرزشیں
ہاتھ دعاؤں کے لیے دراز
اس نے پکارنا چاہا
اپنے رزم نامے لیتے جاؤ
لیکن خاموش رہی
جب وہ سرحدوں پہ پہنچے
ان کی آنکھوں میں تصویریں تھیں
دلوں میں حسرتیں
قدموں میں لغزشیں
اس نے بہت چاہا کہ انھیں نہ پکارے
اپنی لوریاں لیتے جاؤ
سبھوں نے مڑکر اس کی طرف دیکھا
اور کہا
ہم پتھر نہیں ہیں

جو کوئے یار سے نکلے

ہماری خواب گاہوں سے چرا کر لے گیا کوئی
طلسمی نیند کے جھونکے
وہ نقشِ پا
سفر کی کوئی شد بد بھی نہ تھی جن کو
نئے رستوں کی متلاشی
گریباں کی طلب
گردِ رہِ منزل
کہ دامن چاک کے خواہاں
ابھی تک ریشم واطلس کے پردے سرسراتے ہیں
گلِ داؤدی بھینی خوشبوؤں سے گھر سجاتا ہے
مگر شوقِ طواف کوچۂ جاناں کی یورش میں
بکھرتے جاتے ہیں زنداں
سمٹتی جاتی ہے سیڑھی
صحن کچھ گھٹتا جاتا ہے

Dr. Shahnaz Nabi
87/1, College Street,
Kolkata - 700 073. (W.B)

شہناز فاطمہ صدیقی

غزل

ان کے دامن میں چاند تارے ہیں
اپنی جھولی میں بس خسارے ہیں

میں بھی واقف سمندروں سے ہوں
لاکھ گہرے ہیں پھر بھی کھارے ہیں

بارہا موت جن سے ہاری ہے
ایسے بھی زندگی کے مارے ہیں

خامشی، چپ، سکوت، ہنگامے
اک ترے کتنے استعارے ہیں

چاند کب سے نظر نہیں آیا... !
بکھرے بکھرے سے سب ستارے ہیں

نیند کے انتظار میں بیٹھے
خواب پلکوں پہ ڈھیر سارے ہیں

دو قدم ساتھ چل نہیں سکتے..!
نام کے ہم سفر ہمارے ہیں

Shenaz Fatima Siddiqui
Qadeem Haider Ganj
Lakkar Mandi, Lucknow-226003 (U.P)

آرتی کماری

غزل

اوقات ان کی چھوڑیئے، جذبات دیکھئے
پہناوا کیا ہے، ان کے خیالات دیکھئے

ان ننھے منے ہاتھوں میں کنکے کا ڈھیر کیوں؟
ان کا بھوشیہ کیا ہے، یہ دن رات دیکھئے

چپ رہ کے بھی تو لوگ بیاں کر ہی دیتے ہیں
خاموشیوں میں لفظوں کی سوغات دیکھئے

اب اس جگ میں پریم کے مطلب نہ ڈھونڈیئے
بس کاروبار دل کے ہیں حالات، دیکھئے

اس چار دن کی زندگی میں کیسا بھید بھاؤ؟
ہم سب کرائے دار ہیں دن رات، دیکھئے

Dr. Arti Kumari
Shashi Bhawan, Azad Colony
Road No. 3, Maripur
Distt. Muzaffarpur-842001 (Bihar)

لذیذ پکوان

اسٹرابیری فز

اجزا: اسٹرابیری تین سے چار عدد، اسٹرابیری جیلی ایک پیکٹ، سوفٹ ڈرنک ایک عدد چھوٹی، چینی دو کھانے کے چمچ، پودینہ دو کھانے کے چمچ، کٹی ہوئی برف حسب پسند

ترکیب: ایک پیالی ابلتے ہوئے گرم پانی میں اسٹرابیری جیلی ڈال کر اچھی طرح ملائیں، پھر اس میں ایک پیالی سادہ پانی ملا کر رکھ لیں۔

بلینڈر میں صاف دھلی ہوئی اسٹرابیری، چینی اور پودینہ ڈال کر بلینڈ کریں، ساتھ ہی تیار کی ہوئی جیلی بھی شامل کرتے جائیں۔

آخر میں اس میں سوفٹ ڈرنک اور کٹی ہوئی برف ڈال کر بلینڈ کر لیں۔

اورنج سوفلے

اشیا: مکھن تین چمچ، میدہ 1/4 کپ، نمک حسب ضرورت، دودھ 2/3 کپ، 3 کپ اورنج جوس، 4 انڈے، 1/4 کپ چینی

ترکیب: سوفلے بیک کرنے کے لیے ڈش کے چاروں طرف گھی لگا کر تیار کر لیں۔ مکھن کو گرم کریں، اس میں میدہ اور نمک اچھی طرح ملا دیں، چولہے سے اتار کر اس میں دودھ ڈال کر چمچ سے اچھی طرح ملالیں

اور پھر اسے پکا کر گاڑھا کر لیں۔ چولہے سے اتار کر اس میں اورنج جوس ملا لیں۔ الگ سے چار انڈوں کی زردی کو پانچ منٹ کے لیے پھینٹ لیں اور ان کو آہستہ آہستہ اورنج جوس والے آمیزے میں ملا لیں۔ اب الگ سے چار انڈوں کی سفیدی کو اچھی طرح پھینٹ لیں اور آہستہ آہستہ اس میں چینی ملا لیں اور پھینٹتے جائیں، پھر اس کو اورنج والے آمیزے میں آہستہ سے ملا کر گھی لگی ڈش میں ڈال دیں، اسے 325 ڈگری پر 60 منٹ کے لیے بیک کریں سوفلے اورنج تیار ہے گرم گرم پیش کریں۔

اسپیشل پکوڑے

اجزا: بیسن ایک پاؤ، پالک آدھی گڈی، صاف کر کے باریک کٹی ہوئی، پیاز ایک بڑے سائز کی چاپ کی ہوئی، ادرک آدھا انچ کا ٹکڑا باریک چاپ کیا ہوا۔

ہلدی آدھا چائے کا چمچ، نمک، سرخ مرچ حسب ذائقہ، بیکنگ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، ہری مرچ دو عدد درمیانے سائز کی باریک کاٹ لیں، ثابت دھنیا ایک مٹھی، زیرہ ایک کھانے کا چمچ صاف کیا ہوا، تمام اجزا

ملانے کے بعد ہلکا سا کوٹ کر سب سے آخر میں تلنے کے وقت ڈالیں۔
آئل تلنے کے لیے

ترکیب: بیسن میں تمام اجزا کو ملالیں تلنے سے کچھ دیر پہلے آئل کو ایک کڑاہی میں گرم کریں۔ جب تیل گرم ہو جائے درمیانے درجے پر تو اس میں بھجیوں کے لیے تیار کیے ہوئے مرکب میں کٹا زیرہ ملا کر ڈالنا شروع کردیں۔ کچھ خواتین چمچ بھی استعمال کرتی ہیں، پکوڑے بنانے کے لیے لیکن بہتر ہے کہ نہ استعمال کریں براؤن ہونے تک الٹتے پلٹتے رہیں اور دونوں طرف سے تل جائیں تو بٹر پیپر پر نکال کر رکھ دیں۔

رائل بریڈ پڈنگ

اجزا: ڈبل روٹی کے سلائسز چھ سے آٹھ عدد، دودھ آدھا لیٹر چینی آدھی پیالی کنڈینسڈ ملک آدھی پیالی کارن فلار دو کھانے کے چمچ الائچی، بادام پستے حسب پسند آئل تلنے کے لیے۔

ترکیب: سلائس کو کٹر کی مدد سے گول کاٹ لیں، فرائنگ پین میں آئل کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ گرم کریں اور ان کو سنہرا فرائی کرلیں چینی کا شیرہ بنانے کے لیے اس میں چوتھائی پیالی پانی ڈال کر اچھی طرح ملا لیں اور اسے درمیانی آنچ پر تین سے چار منٹ پکا کر چولہے سے اتار لیں فرائی کیے ہوئے سلائسز کو شیرے میں ڈال کر دو سے تین منٹ رکھیں اور نکال کر سرونگ پلیٹ میں رکھتے جائیں دودھ کو ابلنے رکھیں اور ابال آنے پر اس میں الائچی اور بادام پستے ڈال دیں، پانچ سے سات منٹ پکا کر اس میں چمچ چلاتے ہوئے کارن فلار (دو کھانے کے چمچ ٹھنڈے دودھ میں ملا ہوا) شامل کردیں دو سے تین منٹ میں جب دودھ گاڑھا ہونے پر آجائے تو اس میں کنڈینسڈ ملک ملا لیں اور اچھی طرح ملاتے ہوئے چولہے سے اتار لیں۔ چمچ کی مدد سے اس کسٹرڈ کو پھیلا کر سلائسز پر لگا دیں اور بقیہ کسٹرڈ کو سائڈ پر ڈال دیں اس کی پریزنٹیشن کو خوبصورت بنانے کے لیے کسٹرڈ بناتے ہوئے اس میں چٹکی بھر فوڈ کلر ملالیں اور اوپر سے تھوڑے سے بادام پستے چھڑک دیں۔

بھنڈی پیاز بنانے کی ترکیب

اجزا: بھنڈی ایک کلو، پکانے کا تیل تین چائے کے چمچ، زیرہ ایک چائے کا چمچ، پیاز درمیانہ سائز دو عدد، لال مرچ پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ، پسی ہوئی ہلدی آدھا چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، ٹماٹر بڑا سائز دو عدد موٹے کٹے ہوئے، لہسن دو جوئے باریک کٹے ہوئے، ہری مرچیں بارہ باریک کٹی ہوئی۔

ترکیب: بھنڈی کو دھو کر خشک ہونے دیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔

تیاری: ایک بھاری پیندے کے برتن یعنی فرائنگ پین میں ایک چمچ تیل گرم کریں اور گرم گرم تیل میں زیرہ اور لہسن فرائی کر کے کٹی ہوئی بھنڈی تیز آنچ پر تیزی سے تل لیں۔ اس طرح بھنڈی کا لیس ختم ہو جائے گا۔ تلی ہوئی بھنڈی فرائنگ پین میں سے نکال کر الگ برتن میں رکھیں اور فرائنگ پین میں دو چمچ تیل ڈال کر گرم کریں اور کٹی ہوئی پیاز اور ہری مرچیں ہلکی سنہری تل لیں۔ اب دو چمچ پانی میں لال مرچ پاؤڈر نمک اور ہلدی ملا کر تلی ہوئی پیاز اور ہری مرچوں میں شامل کر کے دو تین منٹ تک بھونیں۔ بھنے ہوئے مسالے میں تلی ہوئی بھنڈیاں ڈال کر چمچ سے اچھی طرح مکس کردیں۔ آخر میں مسالہ بھنڈی پر کٹے ہوئے ٹماٹر پھیلا کر کٹا ہوا ہرا دھنیا چھڑک دیں اور بھنڈی کو ہلکی آنچ پہ دم پر رکھ لیں۔ اس طرح بھنڈی اپنے اور ٹماٹر کے رس میں پک کر نرم ہو جائے گی۔ پکنے کے دوران ایک یا دو مرتبہ چمچ سے بھنڈی کو پلٹ دیں۔ اگر پانی خشک نہ ہوا ہو تو چند لمحے کے لئے ڈھکن کھول کر نمی ختم ہونے دیں۔ پانی بھاپ کی صورت میں اڑ جائے گا۔ اب گرم گرم بھنڈی کے لئے تیار ہے۔

احسان رؤف

عورتوں کی مخصوص غذائیں

صحت کے اعتبار سے اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قدرتی ذرائع (Natural Sources) سے تیار شدہ غذاؤں کا استعمال تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے، بھلا ہو میگی، نوڈلس، پزا، ہاٹ ڈاگ اور میکرونی جنھوں نے اسنیک (Snacks) کے نام پر ایسی دھوم مچا رکھی ہے کہ ہم قدرتی غذاؤں سے دور ہوتے چلے گئے۔ ہمارے بچپن میں مشروب کے نام پر لیموں اور شہد سے بنا شربت، بیل کو گھول کر بیج علاحدہ کرکے شکر ملا کر مشروب بنانا، فالسہ کو کچل کر بیج نکال کر شربت بنا کر پینا اور پلانا عام تھا، سخت گرمیوں میں تخم بالنگہ کا شربت تو متوسط گھرانوں کا معمول تھا۔ صراحی، گھڑے کی جگہ اب فرج نے لے لی ہے۔ پہلے باقاعدہ گھڑونچی بنائی جاتی تھی، اس کے چاروں طرف بالوں رکھ کر اسے پانی کے لیے تیار کیا جاتا تھا اس طرح نہایت سوندھی خوشبو پانی کے ساتھ مہکتی تھی اور ایک خوشگوار آسودگی بخشتی تھی۔ یہ ترقی یافتہ دور کی دین ہے کہ اب ہم زنگ شدہ مشینوں اور معدنی اجزاء سے تیار کیے گئے چھاننے والے راڈس (Filteration Rods) کے ذریعہ صاف کیے پانی کے عادی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ حال ہی کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ تمام آلات کینسر جیسی مہلک بیماریوں کا سبب بن رہے ہیں۔ آج بھی 50 فٹ کے بعد کی بورنگ کے ہنڈ پائپ زیادہ محفوظ اور صحت بخش ہیں۔

یہی حال دوسری قدرتی غذاؤں کا بھی ہے پہلے نیا گیہوں دھویا جاتا تھا تاکہ اس کی گرمی نکل جائے آج منڈیوں سے گیہوں سیدھے مل

چلا جاتا ہے۔ اور اسے خوش رنگ بنانے کے لئے چاول کی کنکی ملاتے ہیں (بہت ممکن ہے کہ اسے سفید بنانے کے لئے چاک جیسی چیزیں ملائی جاتی ہوں)

کچھ اسی طرح کا معاملہ چاول کے ساتھ ہے چاول کی بھوسی علاحدہ کرنے کے بعد وٹامن چاول سے ختم ہوجاتے ہیں، آج ساری سبزیاں، میوے اور دوسری غذا بخش چیزوں میں کیمیکل ملا کر ان کی افادیت ختم ہورہی ہے۔ افسوس کہ رحم مادر میں آتے ہی بچہ یہ نقلی اور کیمیکل ملی ہوئی چیزیں اس کے جسم کا حصہ بن جاتی ہے۔

اب معاملہ یہ ہے کہ دوران حمل بڑھتی ہوئی بھوک کو مٹانے کے لئے میگی، پزا اور میکرونی کھلائی جاتی ہے پہلے لائی اور جو کے بنے ستو، اور قدرتی طور سے تیار کی گئی غذائیں جس میں کشمش، بادام، گوند ببول، اور ناریل جیسی چیزیں ملا کر حاملہ عورتوں کو کھلاتے تھے بھی جس سے عورتوں میں نہ خون کی کمی ہوتی تھی نہ چکر آتے تھے، نہ پیروں میں اینٹھن ہوتی تھی ۔اس طرح کی ساری غذائیں نہ تو جسم کو بہت فربہ بناتی تھی نہ ہی انھیں کمزور۔ کیلشیم کی کمی کے لئے پستہ، بادام، اخروٹ اور چھوارا، اسگند، ستاور، اور موصلی جیسی چیزوں کے سفوف کھلاتے تھے۔

اگر خواتین کو قے اور متلی کی شکایت ہوتی تھی تو بجائے مسکن اعصاب دواؤں کے آلو بخارا، اور املی جیسی چیزیں دی جاتی تھیں۔ اس طرح اگر عورت کو شدید قبض ہو تو منقی اور انجیر کھلاتے تھے جس سے طاقت بھی آتی تھی اور قبض بھی ختم ہوجاتا تھا۔

ضرورت یہ ہے کہ اب ہم قدرتی غذاؤں کی طرف واپس آئیں او رپھر لائی اور جو کے ستو، انجیر، منقی، کشمش، بادام، پستہ، اخروٹ، ستاور، موصلی جیسی چیزوں کا استعمال شروع کریں۔ ورنہ آگے آنے والی نسل ایسے لاعلاج امراض میں مبتلا ہوجائے گی جن سے نجات پانا مشکل ہوجائے گا۔

مخصوص امراض کی مفید غذائیں

اگر جسم بہت لاغر ہو کہ دیکھنے میں اچھا نہ لگے تو یہ نسخہ استعمال کرائیں۔

25 گرام چنے اور ایک چھوارا رات میں بھگودیں صبح کچھ ملائے بغیر کھائیں۔

۔مٹر کو پانی میں بھگودیں جب اچھی طرح پھول جائے تو توے پر بھون لیں اور نمک و مرچ سیاہ چھڑک کر کھلائیں۔

۔ہڈی کے گودے کے ساتھ بیسن ملا کر حلوہ بنالیں اور روزآنہ ایک چمچ صبح کھلائیں، کچے ناریل کا پانی پلائیں۔

۔مچھلی کے ٹکڑے کرلیں پھر بلا نمک اور تیل کے توے پر تل کر کھلائیں۔

۔انڈے کو اتنا ابال لیں کہ زردی خشک نہ ہونے پائے روزآنہ کھلائیں۔

۔بھوک کم لگے تو یہ استعمال کرائیں۔

۔ٹماٹر کا سوپ تیار کرلیں اس پر تھوڑی سے سیاہ مرچ چھڑک کر کھانے سے پہلے پلائیں۔

۔کرم کلہ اور پالک دونوں کا سوپ بنالیں اور ادرک چھڑک کر کھلائیں

کمر میں درد ہو تو یہ نسخہ کھلائیں

۔ستاور، موصلی سفید، اسگندھ، مصری تینوں برابر لیکر سفوف بنائیں اور آدھا چمچ صبح شام کھلائیں۔

۔موچرس، گوند ببول، چنیا گوند، ناریل، برابر لے کر سفوف بنالیں اور 3 گرام صبح شام کھلائیں۔

۔کھیرے ککڑی کے بیج، ادرک ہر ایک 3 گرام، انجیر اعدد کے ساتھ کھلائیں

پیروں میں اینٹھن ہو، چکر آئیں یا نظر کمزور ہو تو سونف، تخم کدو شیریں، پستہ، بادام، ہموزن سفوف بنالیں اور 3 گرام صبح شام کھلائیں۔

Dr. Ehsan Rauf
476/6C Behind Madeh Ganj
Police Chowki, Sitapur Raod
Lucknow-226020 (U.P)

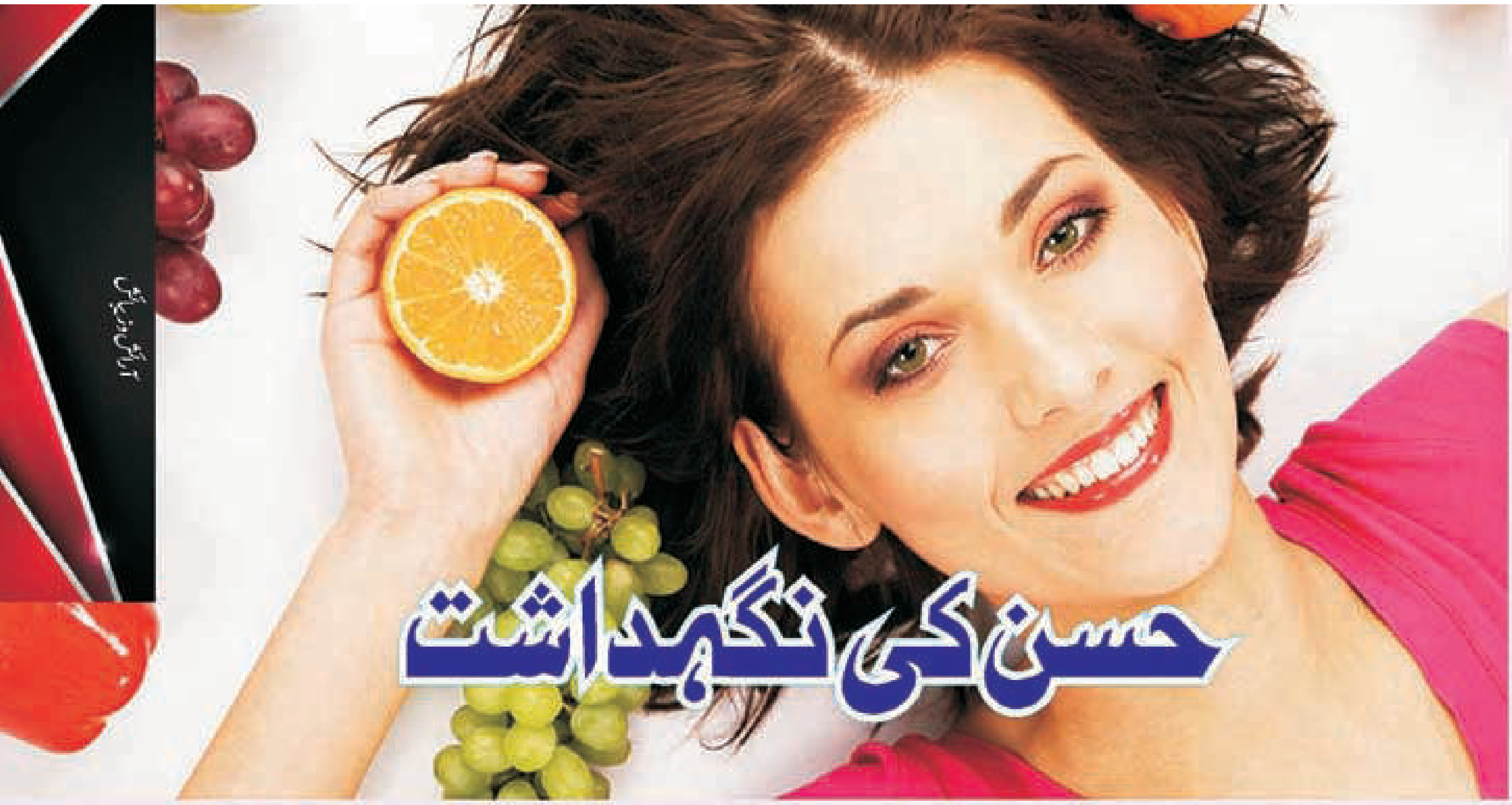

حسن کی نگہداشت

بیسن کا ماسک چہرے کی چکنائی دور کرے

ہینڈسم، اسمارٹ اور خوبصورت دکھنا کون نہیں چاہتا۔ مرد و زن دونوں کی یہی خواہش رہتی ہے کہ وہ خوبصورت نظر آئیں۔ صنف نازک تو ہر وقت خوبصورت دکھائی دینا چاہتی ہے اس کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کرتی

ہے۔ چہرے کی جلد کو نرم و ملائم و خوبصورت بنائے رکھنے کے لیے وہ گھریلو ٹوٹکوں کا جہاں سہارا لیتی ہے وہیں مہنگی کریم بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتی ہیں ماہرین کا مشورہ ہے کہ کیمائی کریموں کے بجائے گھریلو ٹوٹکے اپنائیں۔ گھریلو ماسک کا استعمال کریں یہ چہرے کی جلد کی صحت کے لیے بہتر مانے جاتے ہیں ہر گھر میں بیسن پایا جاتا ہے اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ بیسن کا ماسک بھی چہرے کی جلد کو نرم، ملائم و چمکدار بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اور اسکے استعمال سے جلد کے مسائل حل ہوجاتے ہیں۔ سورج کی مضر شعاعوں سے جلد بے رونق ہوجاتی ہے اس شکایت کو دور کرنے کیلئے بیسن کے ماسک کا استعمال مفید مانا گیا ہے۔ بیسن میں چکنی

بھر ہلدی پاوڈر، لیموں کے رس کے چند قطرے اور تھوڑا دہی ملا کر اس کا آمیزہ بنالیں۔ اور اس آمیزے کو چہرے پر لگائیں جب یہ ماسک خشک ہوجائے تو اسے سادہ پانی سے دھولیں اس کو چند دنوں تک باقاعدگی کے ساتھ استعمال کریں اس عمل سے دھوپ سے خراب ہونیوالی جلد ٹھیک ہوجائے گی۔ چہرے کے جلد کی چکنائی کو دور کرنے کے لیے بیسن میں عرق گلاب ملا کر اس کا آمیزہ بنالیں اور اس آمیزہ کو چہرے پر اپلائی کریں۔

گرمیوں میں جلد کی حفاظت بھی مسئلہ

گرمیاں عروج پر ہیں۔ 11 بجے دن کے بعد باہر نکلنا محال ہوچکا ہے۔ ایسے میں خواتین کی خوبصورت، ملائم و نازک جلد کی حفاظت کرنا بڑا مسئلہ ہوجاتی ہے۔ سورج کی تیز کرنوں سے جلد کو بچانے کیلئے مختلف سن بلاکس اور کریموں کا استعمال کیا جاتا ہے مگر صد فیصد نتائج برآمد نہیں ہوتے ان کیمیائی اشیاء کے بجائے قدرتی اور گھریلو نسخے آزما کر آپ اپنی جلد، دھوپ کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ سورج کی تپش سے جل چکی جلد کا صحیح علاج ایلوویرا سے ہی

ممکن ہے یہ ایک قدرتی جیل ہے۔ ایلوویرا کے پتے حاصل کریں اور انہیں کاٹ کر اس کا گودا چہرے پر لگاتے رہیں کچھ دیر بعد چہرہ کو دھولیں یہ عمل چند روز تک مسلسل کرتے رہیں اس سے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ بیسن' دہی اور لیموں کا ماسک بھی سورج کی تپش سے جلد کو بچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس ماسک کے استعمال سے چہرہ کھل اٹھتا ہے چند گرام بیسن لے لیں اس میں تھوڑا دہی اور چند قطرے لیموں کے جوس کے ملالیں۔ ان تینوں کو آپس میں ملالیں اور چہرے پر اپلائی کریں خشک ہونے کے بعد دھولیں۔ اس ماسک کو 10 دن تک استعمال کریں انشاء اللہ دھوپ کی شدت سے مرجھا گئی جلد اچھی حالت میں آجائے گی۔ برف اور دودھ کے کیوبس بھی چہرے پر ملنے سے حیرت انگیز نتائج حاصل ہوں گے۔ دو حصہ پانی اور ایک حصہ دودھ کو کیوب کی شکل میں فریج میں رکھ دیں جب یہ جم جائیں تو ان ٹکڑوں کو چہرے پر ملتے رہیں۔ اس عمل سے مرجھا گئی جلد میں نکھار آجائے گا۔ ہلدی اور دودھ کے ماسک کو بھی گرمیوں میں چہرے کی جلد کے تحفظ کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ ہلدی پاوڈر کو دودھ میں ملا کر چہرے پر لگائیں یہ گھریلو نسخہ چند دنوں میں دھوپ کے اثرات کو ختم کر کے آپ کے چہرے کو نکھار دے گا۔

دانتوں کی حفاظت کریں

سفید اور چمکدار دانت اور صحت مند مسوڑھے، صحت مندی کی علامت ہیں۔ مضبوط دانت غذا کو کترنے اور چبانے کے علاوہ صحیح تلفظ کی ادائیگی میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں مگر آج نوجوان بالخصوص خواتین، دانتوں اور مسوڑھوں کی صحت سے لاپرواہی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ دانتوں کے کئی امراض ہیں جن کا صحیح علاج ایک کامیاب اور ماہر سرجن ڈینٹسٹ ہی کرسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دانتوں کے امراض امیر لوگوں کی بیماری ہے۔ دانتوں کے امراض ایسے لوگوں کو لاحق ہوتے ہیں جو روزانہ کثرت کے ساتھ بیکری اشیاء، چاکلیٹ اور میٹھی اشیاء کھانے کے بعد باقاعدگی سے رات میں برش نہیں کرتے اس سلسلہ میں بچے اور خواتین لاپرواہی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ مسوڑھوں کے ارد گرد، غذائی اشیاء

چاکلیٹ اور دیگر ذرات اور میل کچیل جمع ہوجانے سے بیکٹر یا پیدا ہوتے ہیں اس سے Gingiritis بیماری لاحق ہوتی ہے۔ اس مرض کی علامتوں میں مسوڑھوں میں سوجن، درد، جلن اور خون آتا ہے۔ اگر اس کا علاج نہ کیا جائے تو پھر دانت ہلنے لگتے ہیں اور دانت ٹوٹ کر گرجاتے ہیں اس کیفیت کو Pepriodontitio کہتے ہیں اس میں دانت کی گرفت کمزور ہوتی ہے یہ ایک عام مسئلہ ہے۔ وٹامن سی کی کمی، ذیابطیس ٹائپ ٹو سے بھی یہ مرض لاحق ہوسکتا ہے۔ ناشتہ کے بعد اور رات میں سونے سے قبل دانتوں کو برش کریں۔ پائیوریا بھی ایک مرض ہے اس میں مسوڑھوں سے خون آنے لگتا ہے۔ دانتوں میں کیڑا لگنا بھی عام بیماری ہے۔ کیڑا لگے دانت میں شدت کا درد ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے مریض غذا لینے کے بھی قابل نہیں رہتا۔ پائیوریا میں منہ سے بدبو آنے لگتی ہے۔ شہادت کی انگلی کو گیلی کرتے ہوئے مسوڑھوں کا مساج کریں۔ نرم بال والے برش سے روزانہ 3 بار دانتوں کی صفائی کریں۔

جسم کو متوازن بنانے کی ورزش

ورزش یا کسرت کی اہمیت سے کوئی عقل مند انکار نہیں کرسکتا۔ ہر کوئی ورزش کے فوائد کا قائل ہے۔ ورزش کے کئی فوائد ہیں اس سے صحت بہتر رہتی ہے خطرناک امراض بی پی' شوگر' قبض جوڑوں میں درد کو قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔

جسم کو متوازن بنانے کیلئے بھی ورزش کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔ اس مخصوص قسم کی ورزش سے آپ گردن اور پشت کے کھنچاؤ کو کم کرسکیں گے اور یہ ورزش کولہوں' کمر اور جسم کے درمیانی حصہ کو متوازن اور مضبوط بنادے گی۔ دونوں

پاؤں کے درمیان فاصلہ رکھ کر کھڑے ہوجائیں اور آپ کے دونوں ہاتھ گردن کی پشت پر رہنا چاہئے۔ اس پوزیشن کو برقرار رکھتے ہوئے آپ اپنی کمر کو بائیں جانب جھکائیں اسی طرح پیچھے اور آگے کی جانب بھی جہاں تک ہوسکے جھکتے رہیں روزانہ یہ ورزش 5 سے 10 مرتبہ کریں۔ کم از کم دو ماہ تک یہ ورزش کرنے سے نتائج حوصلہ افزاء برآمد ہوں گے۔ اس سے جسم متوازن اور پرکشش ہوجائے گا۔

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' فروری 2018 وصول ہوا۔ یہ مجلّہ فی الواقعی نہایت حسین وجمیل ہے۔ ہر نئے شمارے کے ساتھ اس کے حسن میں متواتر اضافہ ہوتا ہی جارہا ہے۔ آپ نے جو خواب دیکھا یہی اس کی حسین تعبیر ہے۔ اس رسالے نے بڑی سرعت سے اپنی شناخت کے ساتھ ساتھ اپنی ساکھ بھی قائم کرلی۔ صف اوّل کی ادیبہ محترمہ جیلانی بانو سے لیا گیا انٹرویو بہت شاندار رہا۔ اس سے نئی لکھنے والی خواتین کو یقیناً تحریک ملے گی۔ ''صنفی مساوات.....'' ص 11 پر بڑا اچھا مضمون لکھا گیا، مگر اس میں کچھ شکوک پھر بھی رہ گئے۔ اوّل تو یہ کہ ''صنفی مساوات'' کی تعریف نہیں کی گئی کہ اس سے آخر کیا مراد ہے؟ مضمون سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ مردوں کی مخالفت میں لکھا گیا ہے۔ لیکن ہمیں اس طرح کے موازنہ اور تقابل میں اپنی توانائی صرف نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ یہ گمراہ کن گمان ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سمجھداری ہر دو اصناف میں پروان چڑھائی جائے، کیونکہ ناسمجھ افراد دونوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ مرد کی عقل اس وقت تک نامکمل رہتی ہے جب تک کہ اس میں عورت کی عقل شامل نہ ہو۔

بزرگوں سے سنا تھا کہ پہلے زمانے میں لڑکیوں کو محض اس حد تک تعلیم دی جاتی تھی کہ بس وہ کوئی عبارت پڑھ پائیں، لکھ نہ پائیں کہ مبادا کہیں کسی کو کچھ لکھ نہ دے۔ اب موبائل سے وہ اندیشہ جاتا رہا۔ قدرت نے ہر لحاظ سے عورت کو نازک بنایا ہے۔ اس لیے اس کی اور اس کے مفادات کی ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ مرد سمجھدار اور اس میں ذمہ داری کا احساس ہو۔ نااہل مردوں سے عورت کو خود مکتفی ہونا از حد ضروری ہے۔ فن خوشنویسی میں..... خواتین کا حصہ (ص 18) درحقیقت بہت محنت سے لکھا ہوا مضمون ہے جس میں کوئی اکتیس خوشنویس خواتین کا ذکر ہے۔ مینا کاری پر لکھا ہوا مضمون (ص 22) یوں تو اچھا ہے لیکن از حد مختصر اس لیے اس میں تشنگی باقی رہی۔ خواتین کے خلاف خانگی تشدد کے خاتمہ کا قانون (ص 24) غالباً گذشتہ سے پیوستہ اور خواتین کے لیے مفید مضمون ہے۔ تاکہ بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اس کے بعد ص 28 تا ص 51 تک ایک سے بڑھ کر ایک کوئی آٹھ کہانیاں مندرج ہیں۔ کہانی ''بڑواچ'' (ص 31) بہت پسند آئی مگر اس میں کسی اہم تانیثی کردار کی کمی محسوس ہوتی رہی۔ نظموں میں ص 54 کی غزلیں بہت خوب بہت عمدہ ہیں۔ لذیذ پکوان ص 55 پر دی گئی تصاویر دیکھ کر طبیعت بس لقمہ اٹھانے کے لیے بیتاب ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو اپنی صحت سے شکایت رہتی ہو انہیں ص 57 پر دی گئی معلومات سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ص 60 اور ص 61 پر دیے گئے چینی ٹوٹکوں سے حسن نکھارا جاسکتا ہے، آزمائش شرط ہے۔ ان کے علاوہ فرہنگ آصفیہ سے جابجا کوئی سات اقتباسات دیے گئے ہیں جو قابل غور ہیں۔ ص 62 پر قارئین نے اپنے زرین آراء اور مشوروں سے نوازا ہے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ مخلص

مصطفی ندیم خان غوری، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ خواتین دنیا کے متعلق جہاں تک میرا خیال ہے یا میری نظر میں اتنا عمدہ رسالہ اتنی کم قیمت یعنی صرف 10 روپیہ ماہانہ، 100 روپیہ سالانہ ہمارے لیے خصوصی طور پر خواتین کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔

تحفہ ہے۔ یہاں پر میں ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ اِس رسالہ کا میں اکتوبر کے ماہ سے خریدار ہوں۔ میں نے اپنے ساتھ شعبہ تعلیم نسواں کی ایک بہترین شخصیت کی حامل استاد اور ایک ریسرچ اسکالر کو بھی رسالہ کا خریدار بنایا ہے۔ انشاءاللہ مسلسل خریدار رہوں گا اور دیگر افراد کو بھی خریدار بنانے کی کوشش جاری ہے۔ میرے مطالعہ اور معلومات کے مطابق یہ رسالہ خواتین سے متعلق ایک اہم رسالہ ہے، اس طرح کا رسالہ بالخصوص اردو زبان میں ابھی تک میرے مطالعہ میں نہیں آیا ہے۔ یہ بہت ہی خوش آئند بات ہے کہ اِس رسالہ کی اشاعت ہوئی، رسالے کے سارے کالم خاص طور سے 'قانون میں خواتین' کا کالم قابل تعریف ہے۔ خواجہ عبدالمنتقم کا کتابچہ "خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم" کے ذریعہ قوانین، جرائم، تشدد وغیرہ کی جو معلومات دی جارہی ہیں وہ قابلِ ستائش ہے اور قارئین و معاشرے کے لیے بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوگی۔ ہمارے معاشرے کو آج اِس طرح کی معلومات کی شدید ضرورت ہے کیوں کہ معاشرے کے افراد خاص کر خواتین تعلیم یافتہ تو کسی طرح ہو جارہی ہیں لیکن اکثر خواتین حقوق اور قوانین سے ناواقف ہوتی ہیں۔ اِس رسالہ میں تاثرات کے صفحہ کو شامل کرنا ایک بہت ہی عقل مندی کا کام ہے۔ علاوہ ازیں آپ سے گزارش ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے کتب خانہ کے لئے اِس رسالہ کی ایک کاپی ارسال کریں آپ کی مہربانی ہوگی اور آپ کا فائدہ بھی کیوں کہ یہاں اِس رسالہ سے بہت کم افراد واقف ہیں۔ ساتھ ہی میں ایک بات واضح کردوں کہ میں نے اپنے طور پر یہاں کے لائبریرین سے اِس رسالے کی فراہمی کے لیے گزارش کی ہے۔ اِس کے علاوہ رسالے کے فروغ کے لئے دیگر اداروں جہاں شعبہ تعلیم نسواں موجود ہے ان سے رابطہ قائم کر کے انہیں رسالے کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد رسالے کے خریدار بن سکیں اور خواتین سے متعلق مختلف قسم کے مضامین جیسے جرائم، قوانین، حقوق، مساوات اور بااختیاری وغیرہ پر تحریر کر کے ارسال کیے جاسکیں۔ آخر میں اردو زبان کی مسلسل خدمت کرنے والے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تمام اراکین کا بے حد شکریہ اور آپ سب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

امان اللہ، شعبۂ تعلیم نسواں، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ماہ اپریل کا خواتین دنیا میرے سامنے ہے۔ گو کہ تاخیر سے موصول ہوا لیکن یہ ماہنامہ بھی اپنے سابقہ شماروں سے دو قدم آگے ہی نظر آتا ہے۔ فہرست مضامین ہی ایسی ہے کہ ہر مضمون اپنی طرف توجہ کھینچتا ہے۔ شمارے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کئی ایسی قلمکارائیں نظر آئیں جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں پڑھا لیکن ان کے مضامین، کہانیاں اور شاعری دل کو چھو لیتے ہیں۔ 'عالمی سطح پر اردو زبان کی مقبولیت' پر عائشہ فرحین صاحبہ کا بہت اچھا مضمون ہے۔ فردوس مسرت، ذکیہ سلطانہ نیر، صبیحہ اطہر کے مضامین بھی بہت اچھے لگے۔ آمنہ ابو الحسن، ترنم جہاں شبنم کی کہانیاں دل پر دیر تک اثر کرنے والی ہیں۔ اس کے علاوہ مستقل کالم حسن صحت، آرائش و زیبائش وغیرہ بھی بہت اچھے رہے۔ یہ رسالہ روز بروز ترقی کی ان اعلیٰ منازل کو چھوتا جاتا رہا جو کبھی اردو کے سنہری دور میں بہت سے مقبول رسائل کو نصیب ہوئی تھیں۔ بین الاقوامی معیار کے ماہنامہ خواتین دنیا کو بجا طور پر خواتین کا پہلا ترجمان قرار دیا جاسکتا ہے۔ میری طرف سے تمام کونسل کے لوگوں کو دلی مبارکباد۔

شمائلہ فاطمہ، کریم نگر، امراؤتی، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہندوستان کا واحد اردو ادارہ ہے جس نے قدم قدم نئے سنگ میل نصب کیے ہیں اردو کے کئی معتبر قلم کاروں کی مختلف موضوعات پر شائع شدہ کتابیں اس کا بین ثبوت ہیں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ، احیاء و ارتقا میں قومی اردو کونسل کا ہر کام ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' بھی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ میری معلومات کے مطابق تقریباً دو سال پہلے اسے جاری کیا گیا ہے لیکن میرے پاس صرف مارچ اور اپریل 2018 کے شمارے ہی پہنچ سکے ہیں دونوں رسالوں نے میرے من کو موہ لیا۔ شروع سے آخر تک ایک ایک لفظ کا دوبار مطالعہ کیا۔ ہر بار نیا لطف اور نیا سرور حاصل ہوا۔ میری طرف سے کونسل کے سربراہ، اراکین، ملازمین اور رسالے سے وابستہ تمام افراد کو دلی مبارکباد۔ بالخصوص حکومت ہند کی وزارتِ فروغ انسانی وسائل کو میں صمیم قلب سے مبارکباد دیتی ہوں کہ جس کی بدولت کونسل دل کھول کر اردو زبان کی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

اپریل کا شمارہ میرے پیش نظر ہے اس میں صبیحہ اطہر کا مضمون 'مختلف زاویوں کی پارکھ، ش بانو ادیب' نے بہت متاثر کیا۔ ش بانو ادیب پر بہت سے مضامین لکھے گئے لیکن صبیحہ اطہر نے جس عرق ریزی سے ان کی تنقیدی بصیرت اور عمیق النظری کا جائزہ لیا ہے، ایسے مضامین پڑھنے کو نہیں ملے میری دعا ہے کہ صبیحہ اطہر خوب ترقی کریں، خوب لکھیں اللہ ان کے علم میں وسعت پیدا کرے آمین ثمہ آمین۔ ایک گزارش یہ تھی کہ جو لوگ مستقل ممبر ہیں یعنی جنھوں نے سالانہ چندہ جمع کر رکھا ہے، ان کے یہاں عموماً اردو کونسل کے رسائل تاخیر سے پہنچتے ہیں یا کبھی کبھی آتے ہی نہیں براہ کرم اس طرف توجہ دینے کی زحمت کریں شکریہ۔

ندا فرحین، پوسٹ نیٹ بھون، تلک روڈ، حیدرآباد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مغرب میں تنقید کی روایت
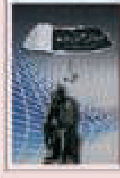
مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)
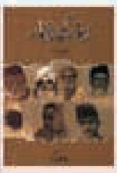
مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

بہارِ گلشنِ کشمیر (جلد اوّل و دوم)

مرتبہ و مولفہ: پنڈت برج کشن کول
و پنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 454 و 537
قیمت: 275 و 300 روپے

دیوندر ستیارتھی
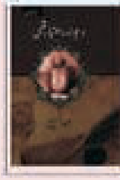
مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

رشید حسن خاں
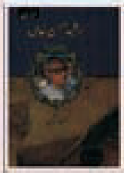
مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

سید امتیاز علی تاج
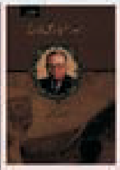
مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80 روپے

علی سردار جعفری
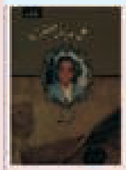
مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

یاس یگانہ چنگیزی
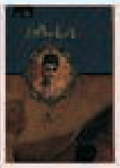
مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

کلیات مضامین وحید اختر (جلد ششم)
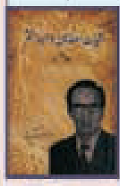
مرتب: ڈاکٹر سرورالہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: -/115 روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)
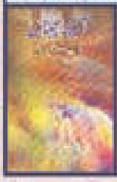
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)
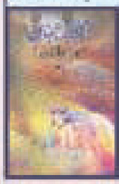
تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)
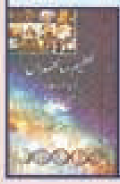
مصنف: احرار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32 روپے

اسرار کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)
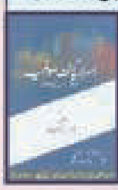
مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
و حواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335 روپے

انتخابِ سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

دستورِ ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر
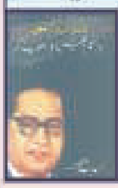
مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے
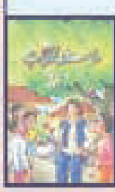
مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجرالدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم
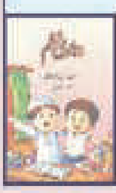
مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجرالدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی
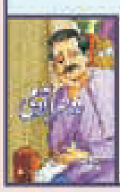
مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجرالدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly May 2018, Vol. 02, Issue: 5 **RNI. No. DELURD/2017/74026**

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

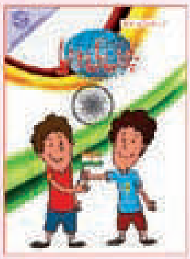

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

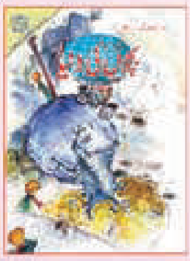

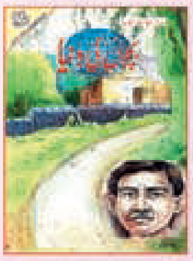

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020

And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025